مطالعۂ پاکستان

گیارہویں ، بارہویں جماعتوں کے لیے







سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ ، جام شورو

مُطالعہ پاکستان

گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لیے



پبلشرز

دی ٹائمز پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی



برائے

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ جامشورو

تیار کردہ: سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ۔ و منظور کردہ:
بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کراچی، حیدرآباد
اور سکھر:

مدیران

محمد سلیم اختر، سینئر ماہر مضمون

مسز حفصہ جاوید، ماہر مضمون

سبطِ حسن، ماہر مضمون

مطابع اور مطبع دی ٹائمز پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

فہرست اسباق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



قیامِ پاکستان

پاکستان 14 اگست 1947ء کو عالمِ وجود میں آیا ۔ اس کے قیام کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ جنوبی ایشیا میں اسلام کی آمد کا جائزہ لیا جائے اور اس فکری، سماجی و مذہبی انقلاب کو سمجھا جائے جو اس علاقے کے معاشرے میں اسلام کی بدولت رونما ہوا ۔ یہی حالات تحریک پاکستان کا اصل پس منظر ہیں ۔

عرب تاجر قدیم زمانے سے اپنے تجارتی لین دین کے سلسلے میں جنوبی ایشیا میں آتے جاتے تھے ۔ اسلام آنے کے بعد ، انھی تاجروں کے ذریعے دینِ اسلام کا پیغام بھی اس علاقے تک پہنچا ۔ مقامی لوگ اس پیغام سے متاثر ہوئے مگر باقاعدہ اشاعتِ اسلام کا سلسلہ محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ کے بعد ہوا ۔ محمد بن قاسم نے راجا داہر کو 712ء میں شکست دی ۔ اس کے بعد بزرگانِ دین کی جنوبی ایشیا میں آمد شروع ہوئی ۔

اسلام سے پہلے جنوبی ایشیا کی حالت : برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ سارا علاقہ چھوٹی بڑی کئی حکومتوں میں منقسم تھا ۔ یہ حکومتیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے سیاسی اور جغرافیائی تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہتی تھیں ، یوں سارا علاقہ سیاسی انتشار کی نذر ہو چکا تھا ،

جس کی وجہ سے لوگوں کی مجموعی ترقی پر منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔

جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایک ایسا دور آیا تھا جب کہ بدھ مت اس علاقے کا سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ اس عہد کے ہندو حکمران، ہندو مت کے پُرجوش حامی تھے اور انھوں نے بودھوں پر سختیاں کیں۔ سندھ کے ہندو راجا داہر کے ناروا سلوک کی وجہ سے ہی اس علاقے کی بودھ آبادی مسلمانوں کی امداد کی طالب ہوئی۔

ہندو معاشرہ، سماجی ناانصافی اور بندشوں کا مجموعہ تھا۔ قدیم زمانے سے پورا ہندو سماج چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اسے ذات پات کی تقسیم کہا جاتا ہے۔ چار بڑی ذاتیں یہ تھیں:

(1) برہمن۔ (2) کھشتری۔ (3) ویش۔ (4) شودر۔

برہمن، مذہبی طبقہ کے افراد تھے۔ یہ لوگ ویدی علوم اور مذہبی رسومات کے ماہر تھے، اس لیے انھیں مقدس اور قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا۔ کھشتری وہ تھے جن کے ذمے ملک و قوم کا دفاع اور امن و امان کا قیام تھا۔ راجے، امرا، فوجی اور دیگر حکام اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دو ذاتوں کو بلند مقام حاصل تھا۔ باقی دو ذاتیں، ویش (کاشت کار، تاجر، صنعت کار، کاریگر وغیرہ) اور شودر (جن کا کام باقی ذاتوں کی خدمت بجا لانا تھا) نہایت ذلت و رسوائی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ انھیں بنیادی حقوق حاصل نہیں تھے، یہاں تک کہ قانون کی نگاہ میں بھی وہ اونچی ذاتوں کے برابر نہیں تھے۔ اگر کوئی شودر مقدس ویدوں کا کوئی لفظ سن لیتا تو اس جرم کی پاداش میں اس کے کان میں گرم سیسہ ڈال دیا جاتا۔ شودر بالعموم شہر کی چار دیواری سے باہر رہتے تھے۔ مختلف ذاتوں میں باہمی شادی بیاہ کا رواج نہیں تھا۔ ذاتیں موروثی تھیں، اس لیے ان سے کسی صورت بھی چھٹکارا ممکن نہ تھا۔

تنگ نظری نے ہندو سماج کو مفلوج کر رکھا تھا۔ عورت کو نرو تر مقام دیا گیا تھا۔ بیوہ کی دوبارہ شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ عام طور پر بیوہ کو خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ اس رسم کو ستی کہتے ہیں۔

اسلام کے جنوبی ایشیا کے معاشرے پر اثرات :

تہذیبی اثرات : جنوبی ایشیا میں آنے سے پہلے مسلمان دیگر مہذب دنیا کے اکثر و بیشتر حصے پر چھا چکے تھے ، اس لیے ان کے علوم و فنون اور تمدن میں تقریباً ساری مہذب دنیا کی تمدنی خصوصیات موجود تھیں ۔ مسلم تہذیب نہایت بلند پایہ حیثیت رکھتی تھی ، اس لیے اس نے جنوبی ایشیا کی پسماندہ تہذیب کو جنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کے خدو خال میں اہم مثبت تبدیلیاں پیدا کیں ۔

سیاسی اثرات : (i) مسلمان جہاں بھی گئے ، انہوں نے مضبوط مرکزی حکومت کو رواج دیا اور چھوٹی چھوٹی مقامی حکومتیں ختم ہوتی گئیں ۔ چنانچہ انہوں نے ایک لمبے عرصے تک سارے شمالی برصغیر کو بھی ایک مرکزی حکومت کے ماتحت رکھا اور سارے علاقے میں الدرونی امن و امان بحال کرکے بدامنی کو کچل دیا ۔ یوں ایسے حالات پیدا ہوئے جن سے تمدنی ترقی میں ہمیشہ مدد ملتی ہے ۔

(ii) سیاسی وحدت کے ساتھ ساتھ انتظامی یکسانیت بھی قائم ہوئی ۔ مسلمانوں نے جنوبی ایشیا میں اعلیٰ نظامِ حکومت کی بنیاد ڈالی ۔ اس نظام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ شمالی برصغیر کے وسیع علاقے میں ایک ہی طرز کا نظام قائم تھا ۔ اس انتظامی یکسانیت نے اس علاقے کے مختلف حصوں میں معاشرتی ہم آہنگی پیدا کی ۔

(iii) جنوبی ایشیا کے مسلم فاتحین ایک بڑے اسلامی معاشرے کا حصہ تھے جس سے وہ بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے ، اس لیے ان کی آمد سے بیرونی دنیا کے ساتھ جنوبی ایشیا کے تعلقات قائم ہو گئے ۔

(iv) فنونِ جنگ نے بہت ترقی کی ۔ اگرچہ اسلحے میں زیادہ فرق نہیں تھا مگر مسلمانوں کی جنگی تدابیر ، نظم و ضبط اور لڑنے کا طریقہ ایسا تھا کہ تعداد میں کئی گنا زیادہ دشمن پر فتح پا جاتے تھے ۔ اس علاقے میں بحری فوج کی ابتدا بھی اسی زمانے میں ہوئی اگرچہ اس شعبے میں جنوبی ایشیا کے مسلمان زیادہ ترقی

نہ کر سکے ۔

معاشرتی اثرات (i) جس طرح مسلمانوں کی آمد سے سیاسی وحدت اور انتظامی یکسانیت پیدا ہوئی ، اسی طرح سارے ملک کے طرز معاشرت میں بھی یک جہتی پیدا ہو گئی ۔ سماج کے اعلیٰ طبقوں نے مسلمانوں کا اندازِ زندگی اختیار کیا ۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو ، لباس کے معاملے میں سلیقہ مند نہ تھے ۔ وہ اپنے جسم کو ایک یا دو چادروں سے ڈھک لیتے تھے ۔ مسلمانوں نے پہلی دفعہ لباس سینے کا طریقہ رائج کیا جو زیادہ باپردہ اور زیادہ خوبصورت تھا ۔

(ii) مسلمانوں نے تمام ملک میں امن و امان قائم کیا ، اس سے شاہراہیں محفوظ ہوگئی تھیں ۔ تجارت و صنعت کو بہت ترقی ہوئی ۔ بحری تجارت اپنے عروج کو پہنچی اور دور دراز ممالک کے ساتھ تجارتی روابط قائم ہو گئے ۔ یوں جنوبی ایشیا میں خوش حالی کا دور دورہ ہو گیا ۔

(iii) اسلام انسانی مساوات اور سماجی انصاف کا علم بردار ہے ۔ چنانچہ مسلمانوں کی آمد سے اس خطے کے عوام کو ہندو سماج کی ناانصافیوں سے بڑی حد تک نجات مل گئی ۔ ذات پات کی چکی میں پسنے والے پسماندہ طبقے نے سکھ کا سانس لیا اور اپنی آزاد مرضی سے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا ۔

تمدنی اثرات (i) فنونِ لطیفہ کی جملہ شاخوں نے خوب ترقی کی ۔ اسلامی آرٹ میں پہلے ہی مصر و روما اور یونان و ایران کی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں ۔ اب اس میں جنوبی ایشیا اور چینی مصوری کے نمونے بھی شامل ہوگئے ۔ یوں ایک نئے آرٹ کی بنیاد پڑی جسے **''انڈو اسلامک آرٹ''** کا نام بھی دیا جاتا ہے ۔

(ii) فنِ تعمیر کا بالکل نیا اور اچھوتا انداز ابھرا ۔ اس فن میں مسلمانوں کا ذوقِ سلیم مشہور ہے ۔ وہ جہاں بھی گئے ، انہوں نے ایسی نادر عمارات چھوڑیں کہ وہ آج بھی ماہرینِ فن سے دادِ تحسین وصول کر رہی ہیں ۔ جنوبی ایشیا میں بھی مسلمانوں نے بے شمار حسین عمارات تعمیر کیں جن کے بلند و بالا مینار اور

خوبصورت گنبد و محراب ان کے اسلامی تشخص کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ (تفصیل اسی کتاب کے ثقافت والے باب میں درج ہے) ۔

اس کے علاوہ دوسری صنعتوں مثلاً شال سازی ، قالین بافی اور ململ بافی کو بھی مسلمانوں ہی نے ترقی دی تھی ۔

(iii) مسلمانوں کی فوج میں مختلف قومیتوں کے لوگ شامل تھے ۔ ان کے باہمی میل جول سے رفتہ رفتہ ایک عام مشترکہ ملکی زبان وجود میں آئی جسے اردو کا نام دیا گیا ۔ یہ بھی ایک اہم واقعہ تھا کیونکہ اس سے جنوبی ایشیا کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے عوام ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ان کے مابین میل جول و مفاہمت میں اضافہ ہوا جو ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوا ۔

(iv) مسلم سلاطین کی سرپرستی میں علم و ادب نے بڑی ترقی کی ۔ قیامِ امن اور خوش حالی پیدا کرکے مسلم حکومت نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے جن میں علوم و فنون از خود ترقی کرتے ہیں ۔ علم تاریخ میں مسلمانوں نے خصوصی دلچسپی لی ۔

مذہبی اثرات (i) اسلام سے پہلے جو مذاہب باہر سے جنوبی ایشیا میں آئے ، انہوں نے اپنی جداگانہ حیثیت کھودی اور ہندو مت میں جذب ہو کر رہ گئے ، مگر اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے ، اس لیے جہاں بھی اس کی صدائے حق پہنچی ، مقامی افکار و اوہام اس کے زیر سایہ آ گئے ۔ ایسا دین ، ہندو مت جیسے جامد مذہب سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا ۔ اس کے برعکس یہاں اسلام نے اپنا رنگ جما لیا اور اسلامی تعلیمات کے محاسن سے متاثر ہو کر بہت سے ہندو مشرف بہ اسلام ہونے لگے ۔

(ii) اسلامی توحید اور مساوات کے اثرات اس قدر غالب تھے کہ خود ہندومت میں ایسے بھگت پیدا ہونے لگے ، جنھوں نے بت پرستی سے نفرت کا اظہار کیا اور ذات پات پر کڑی نکتہ چینی کی ۔ یوں ہندومت میں اصلاحی

تحریکیں شروع ہو گئیں۔ اس میدان میں نامور صوفیہ و مشائخ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان بزرگوں میں بعض صاحبِ تصنیف عالم بھی تھے جنھوں نے اپنے قلم سے معارفِ تصوف پر روشنی ڈالی۔ صوفیہ کے گروہ نے تبلیغ اسلام میں بہت حصہ لیا۔ ان کی پاکیزہ زندگی، بلند کردار اور حسنِ اخلاق سے لوگ خود بخود کھچے چلے آتے تھے۔ مسلم معاشرے کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

ابتدا میں جنوبی ایشیا میں آنے والے بزرگوں میں حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش) کا نام قابل ذکر ہے۔ بعد میں سلسلہ چشتیہ کے بزرگ خواجہ معین الدین اجمیری تشریف لائے۔ ان کے خلفا نے جنوبی ایشیا کے کونے کونے میں اسلام کا پیغام پہنچایا۔ سلسلہ سہروردیہ حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ ملتانی کی قیادت میں پھلا پھولا۔ سلسلہ قادریہ کے بزرگوں کا مرکز اُچ شریف تھا۔ پھر سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ آئے۔ اس سلسلے کے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مسلم معاشرے کو ہر قسم کی آلائشوں اور غلط افکار سے پاک کرنے کی سعی کی۔ حضرت عثمان مرندی جنھیں عرف عام میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کہتے ہیں نے بھی اس سلسلے میں بیش قدر خدمت سرانجام دی۔ ان کے سلسلے کو سلسلہ قلندریہ کہتے ہیں۔

پاکستان ۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل کی طرف ایک قدم : ان حقائق سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے جنوبی ایشیا میں زندگی کے ہر میدان میں نمایاں ترقی ہوئی۔ انھوں نے قدیم سیاست اور معاشرے کو بدل کر رکھ دیا اور عدل و انصاف پر مبنی نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں کے زوال پر 1857ء میں انگریزوں نے جنوبی ایشیا پر اپنا تسلط قائم کر لیا جس کے نتیجے میں مغربی تہذیب و اقدار کے اثرات پھیلنے لگے۔ بالآخر جب حالات نے انگریزوں کو بھی اپنی بساط سیاست لپیٹنے پر مجبور کیا تو ذہنوں میں سوال پیدا ہوا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد جنوبی ایشیا میں نیا نظام کیا ہوگا۔

مسلمانوں نے اپنے دور میں اس قدر رواداری سے کام لیا تھا کہ سینکڑوں سال کی حکومت کے باوجود مسلمان اب بھی اقلیت میں تھے اور خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے خاطر خواہ دور اندیشی اور سوجھ بوجھ سے کام نہ لیا تو نئے مغربی جمہوری نظام میں وہ ہندوؤں کے محکوم بن کر رہ جائیں گے۔ ایسے نازک مرحلے پر پاکستان کے قیام کا فیصلہ درحقیقت جنوبی ایشیا کے ایک حصے میں اسلامی معاشرے کی تشکیل کی طرف ایک قدم تھا جس میں مندرجہ ذیل مقاصد کار فرما تھے:

(1) مسلمان طبعاً حریت پسند ہیں۔ وہ کسی کی غلامی قبول نہیں کرتے۔ انگریزوں کے اقتدار میں بھی وہ حصول آزادی کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور اب ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ ہندوؤں کی غلامی قبول کر لیتے۔ قائداعظم نے اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے مسلم لیگ کونسل کے فروری 1940ء کے اجلاس سے خطاب کیا اور فرمایا "ہم نہ برطانیہ کو اپنے اوپر اقتدار قائم کرنے دیں گے اور نہ ہی مسٹر گاندھی اور کانگرس کو۔ ہم دونوں کے اثر سے آزاد رہنا چاہتے ہیں۔"

(2) اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں اسلامی ریاست کے تمام رہنما اصول موجود ہیں۔ مسلمانوں کی دلی خواہش تھی کہ صحیح اسلامی معاشرے کو دوبارہ قائم کریں جس میں عدل، جمہوری مساوات اور سماجی بہبود کی خوبیاں موجود ہوں۔

(3) مسلمانوں کو اپنی بلند پایہ تہذیب و ثقافت پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔ ہندو قوم اس تہذیب کو مٹا دینے کے درپے تھی۔ قیامِ پاکستان کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ اعلیٰ اسلامی اقدار اور تہذیبی و ثقافتی علامات کو بچایا جائے۔

(4) جنوبی ایشیا میں مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی تھی چنانچہ وہ نہایت خوش حال قوم تھے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں ہندوؤں اور انگریزوں کی ملی بھگت سے مسلمان اس علاقے کی نہایت مفلس و بدحال قوم بن گئے۔ سندھ،

سرحد اور بلوچستان جیسے مسلم اکثریت کے صوبوں کی ترقی کو خاص طور پر نظر انداز کیا گیا ۔ پاکستان قائم کرکے جنوبی ایشیا کے مسلمان کو ہندو کے استحصال سے نجات دلانا بھی مقصود تھا تا کہ تمام صوبوں کے مسلمان آزاد اور پرامن فضا میں خوش حالی کی راہ پر گامزن ہو سکیں ۔

(5) پاکستان میں صحیح اسلامی معاشرہ قائم کرکے مسلمان جدید دنیا کے سامنے ایک مثال قائم کرنا چاہتے تھے تا کہ دوسری اقوام اس سے متاثر ہو کر اس کی تقلید کر سکیں ۔ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستان کو عالمِ اسلام کا قلعہ اور مرکز بنا دیا جائے اور یہ مرکز مسلم ممالک کے مسائل حل کرنے میں مدد دے ۔

نظریہ پاکستان

ہر انسان کے سامنے اپنی زندگی کا کوئی مقصد ہوتا ہے ۔ اس مقصد کے بغیر انسان کی زندگی بے معنی قرار پاتی ہے ۔ جب کوئی خاص مقصد بہت سے لوگوں کی زندگی کا مشترکہ نصب العین بن جائے تو وہ ان کا مشترکہ نظریہ حیات کہلاتا ہے ۔ کسی بھی انقلابی تحریک کے پیچھے کوئی نہ کوئی نظریہ کارفرما ہوتا ہے اور کسی بھی قوم کی اجتماعی زندگی میں نظریے کی حیثیت روح کی ہوتی ہے ۔ سیاسی ، معاشرتی اور معاشی پہلو مل کر نظام زندگی ترتیب دیتے ہیں اور ان سب دائروں میں حقوق اور رشتوں کا تعین نظامِ زندگی کا تانا بانا ہے ۔ یہ سب باتیں ایک نظریے کے تحت پاتی ہیں ، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظریے سے زندگی کا نظام بنتا ہے ۔

مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی ہر دو زندگیوں میں ساری ہدایت و رہنمائی اپنے دین سے ملتی ہے ۔ اسلام انسانوں کے مابین تعلقات و حقوق بھی معین کرتا ہے اور ریاست و معاشرے کو بھی منظم کرتا ہے ۔ ہر معاملے میں اصل معیار اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عمل

یعنی قرآن و سنت ہوتا ہے۔ مسلم قوم کا یہی نظریہ حیات، تحریک پاکستان کی اساس بنا۔ پاکستان ایک نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اور یہ نظریہ مسلمانوں کا دین اسلام ہے۔ یہی نظریہ پاکستان کا مفہوم ہے۔ گویا یہاں سیاسی، معاشی، معاشرتی غرضیکہ پوری زندگی کا نظام اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ہوگا اور ہر معاملے میں رہنمائی قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے حاصل کی جائے گی۔

قائداعظم اور نظریہ پاکستان

قائداعظم نے مختلف مواقع پر اپنی تقاریر میں نظریہ پاکستان کی کھل کر وضاحت کی۔ 23 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے تاریخ ساز اجلاس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے دو قومی نظریے کو بڑے مؤثر اور خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ آپ نے فرمایا:

''اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں ہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ چنانچہ اس خواہش کو خواب و خیال ہی کہنا چاہیے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ میں واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔''

قائداعظم نے پُرزور الفاظ میں واضح کیا کہ مسلمان جنوبی ایشیا میں ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک الگ قوم ہیں جس کے لیے الگ وطن از بس ضروری ہے۔ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی 1943ء کے موقع پر قائداعظم نے قرآن پاک کی طرف رجوع کرنے کی اہمیت کی ان الفاظ میں وضاحت فرمائی:

''وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت

استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔

قیامِ پاکستان کے اصل مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے اسلامیہ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے 13 جنوری 1946ء کو فرمایا:

''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا ہمارا مقصود تھا جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔''

اسی طرح اکتوبر 1947ء میں حکومت پاکستان کے افسران سے خطاب کے موقع پر اسی خیال کی یوں وضاحت فرمائی:

''ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں، جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پھلے پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔''

صوبوں میں جد و جہد آزادی

جب سے انگریزوں نے جنوبی ایشیا پر قبضہ کیا تھا، مسلمان کسی نہ کسی صورت میں آزادی کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ انھوں نے مسلح کوششیں بھی کیں اور آئینی ذرائع بھی استعمال کیے۔ مختلف صوبوں نے جد و جہد آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کا ذکر ضروری ہے کیونکہ یہی وہ ندیاں تھیں جو مرکزی تحریک کے عظیم دریا میں شامل ہو کر قوت و عظمت عطا کرتی رہیں۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ : صوبہ سرحد کے غیور مسلمانوں نے جنوبی ایشیا کی تمام ملی و ملکی تحریکوں میں نمایاں خدمات انجام دیں ۔ انگریزوں نے سرحد کو 'سرزمین بے آئین' بنا رکھا تھا ۔ قائداعظم نے 1927ء میں صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کرنے کا مطالبہ کیا چنانچہ یہاں سیاسی اصلاحات کا نفاذ ہوا ۔ جب 1940ء میں قرارداد پاکستان پیش ہوئی تو سرحد کی طرف سے سردار اورنگ زیب خاں نے اس کی مؤثر انداز میں تائید کی ۔ تاہم 1945ء تک مسلم لیگ سرحد میں پوری طرح منظم نہ تھی ۔ کانگرس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور قیامِ پاکستان کے خلاف سخت پراپیگنڈا کیا ۔ 1945ء میں قائداعظم کی کوشش سے مسلم لیگ فعال ہوئی ۔ اب یہاں کی کانگرسی حکومت نے مسلم لیگ کے رضا کاروں اور رہنماؤں پر مظالم شروع کیے ۔ انھیں جھوٹے مقدموں میں ملوث کرکے جیل بھیجا جانے لگا ۔ تقریباً آٹھ ہزار کارکن نظر بند کر دیے گئے مگر مسلم لیگ کی تحریک زور شور سے جاری رہی ۔ ایک خفیہ قلمی روز نامہ 'صدائے پاکستان' اور ایک ریڈیو اسٹیشن بھی شروع کیا گیا جس سے تحریک کو رہنمائی ملتی تھی ۔

جدو جہد آزادی کے سلسلے میں سرحد کے مشائخ کی خدمات قابل قدر ہیں ۔ انھوں نے پورے صوبے میں جوش و خروش پھیلا دیا اور عوام میں قیامِ پاکستان کے تصور کو ابھارا ۔ اسلامیہ کالج پشاور اور ایڈورڈ کالج پشاور کے طلبہ بھی تحریک پاکستان میں پیش پیش رہے ۔ سرحد کی خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔

بلوچستان : انگریزوں نے بلوچستان کو ہمیشہ پس ماندہ رکھنے کی کوشش کی ۔ 1927ء میں مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ اس صوبے میں سیاسی اصلاحات نافذ کی جائیں مگر حکومت اس بات سے گریزاں رہی ۔ جون 1939ء میں بلوچستان مسلم لیگ قائم ہوئی اور قاضی محمد عیسیٰ نے اس میں نمایاں حصہ لیا ۔ لاہور میں انھوں نے ہی بلوچستان کی طرف سے قرارداد پاکستان کی حمایت کی ۔ 23 مارچ

1941ء کو کوئٹہ میں ایک عظیم جلسہ عام منعقد کرکے یوم پاکستان منایا گیا۔ دستور ساز اسمبلی کے انتخاب میں کانگرسی امیدوار کو شکست ہوئی جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ بلوچستان کے عوام کو مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان سے وابستگی تھی۔ 1943ء میں بلوچستان مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی۔

قیامِ پاکستان کے وقت فیصلہ کیا گیا تھا کہ بلوچستان کا شاہی جرگہ یہ طے کرے گا کہ آیا یہ صوبہ، پاکستان میں شامل ہوگا یا بھارت میں۔ اس موقع پر کانگرس نے سازشوں کا جال بچھایا مگر اس کی ایک نہ چلی کیونکہ قائدین بلوچستان نے اس ضمن میں بہت کام کیا تھا۔ شاہی جرگے میں ایجنٹ برائے گورنر جنرل نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے اعلان پڑھنا شروع کیا۔ ابھی اعلان ختم نہیں ہوا تھا کہ نواب محمد خان جوگیزائی نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہم نے پاکستان کے حق میں فیصلہ کر لیا ہے اور سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

سندھ: جنوبی ایشیا میں سب سے پہلے اسلام سندھ میں آیا، اسی لیے اس صوبے کو باب الاسلام کہتے ہیں۔ اس مسلم اکثریتی صوبے کی اہمیت ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے اسے صوبہ بمبئی کا حصہ بنا رکھا تھا۔ بالآخر 1935ء کے ایکٹ کے مطابق مسلم لیگ کی زبردست کوشش سے 1936ء میں اسے بمبئی سے الگ کرکے مکمل صوبے کا درجہ دیا گیا۔ صوبوں میں مسلم لیگ کے ساتھ سب سے قدیم تعلق سندھ کا ہے۔ مسلم لیگ کا سب سے پہلا سالانہ اجلاس دسمبر 1907ء میں کراچی کے مقام پر منعقد ہوا۔ اسی صوبے کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ سندھ مسلم لیگ نے 1938ء میں ایک قرارداد منظور کی جس میں پہلی بار یہ مطالبہ کیا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، وہاں مسلم حکومت قائم کی جائے۔ یہی قرارداد بالآخر قراردادِ پاکستان کا پیش خیمہ بنی۔

1940ء میں قراردادِ پاکستان کی حمایت میں سندھ کی طرف سے سر عبداللہ ہارون نے تقریر کی۔ بعد میں قائداعظم نے صوبے میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جس نے اس ضمن میں بڑا کام کیا، یہاں تک کہ

1943ء میں سندھ میں مسلم لیگ وزارت قائم ہو گئی جو جنوبی ایشیا میں پہلی مسلم لیگی وزارت تھی۔ مارچ 1943ء میں سندھ اسمبلی میں مطالبہ پاکستان کی قرارداد پیش کی گئی جو فوراً منظور کر لی گئی۔ 46-1945ء کے موسم سرما میں منعقدہ انتخابات میں مسلم لیگ نے صوبہ سندھ میں بھاری اکثریت حاصل کی اور وزارت بنائی۔ اس وزارت کو توڑنے کے لیے کانگرس نے بڑی سازشیں کیں جو سب ناکام رہیں۔

سندھ کی جد و جہد آزادی میں پیر صبغتہ اللہ شاہ پیر پگارا کی ہمت و شجاعت ہمیشہ یاد رہے گی۔ ان کے مرید حر کہلاتے ہیں۔ پیر صبغتہ اللہ شاہ نے انگریزوں کے سامنے سر اطاعت خم نہ کیا اور بالآخر دوسری جنگ عظیم کے دوران میں حروں نے مسلح جنگ آزادی شروع کر دی۔ انگریز حکومت کی افواج بڑی محنت اور نقصان کے بعد اسے دبانے میں کامیاب ہوئیں۔ پیر صاحب شہید کر دیے گئے اور ان کے بیٹوں کو انگلستان بھیج دیا گیا۔ اس کے باوجود حروں کے جذبہ حریت میں فرق نہ آیا۔

سندھ میں مشائخ کا سرہندی خاندان حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے آباء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں کے خلاف جد و جہد آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور قائداعظم کا بھرپور ساتھ دیا۔ سندھ کے مشائخ نے جمعیت المشائخ قائم کرکے مسلم لیگ کی حمایت کی۔ طلبہ میں سندھ مدرسہ کراچی کے طالب علم پیش پیش تھے اور سندھ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن بڑی فعال تھی۔ صوبہ سندھ کی خواتین نے بھی جد و جہد آزادی کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ جلسے جلوس نکالے اور ہر خطرے کو پار کرکے قیامِ پاکستان کے تصور کو مزید اجاگر کیا۔

پنجاب: پنجاب آبادی اور وسائل کے اعتبار سے بڑا صوبہ تھا، مگر انگریزوں اور ہندوؤں کی ملی بھگت سے یہاں کے مسلمان استحصال کا شکار تھے۔ عظیم مفکر علامہ اقبال نے اپنے اشعار و افکار سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو

خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور انہیں اپنے اسلامی تشخص کی بحالی کا سبق دیا۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے آزاد مسلم ریاست کا تصور پیش کیا۔ 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں وہ تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔ اس کے بعد پورے صوبے میں مسلم لیگ نے زبردست مہم چلائی۔ 46_1945ء کے موسم سرما میں ہونے والے انتخابات میں پنجاب میں مرکزی اسمبلی کے لیے مسلم لیگ کو سو فی صد کامیابی ہوئی جب کہ صوبائی اسمبلی میں اسے تقریباً 90 فی صد نشستیں ملیں۔

پنجاب کے علما و مشائخ نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا اور اپنے اپنے حلقہ اثر میں عوام کو جد و جہد آزادی کے لیے تیار کیا۔ پنجاب کے مسلم طلبہ بہت بیدار تھے۔ انھوں نے پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن منظّم کی اور علامہ اقبال کے ارشاد پر 1937ء میں ہی اپنے آئین میں آزاد مسلم ریاست کا قیام شامل کر لیا۔ گویا قراردادِ پاکستان منظور ہونے سے پہلے ہی وہ اس مقصد کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ 1941ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں پاکستان کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت قائداعظم نے کی۔ یونینسٹ وزارت کے خلاف سول نافرمانی میں طلبہ پنجاب کے دیہات میں پھیل گئے اور حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔

پاکستان کی کوششوں کے سلسلے میں پنجاب کی خواتین کسی سے کم تر نہ تھیں۔ انھوں نے بیش قدر خدمات سرانجام دیں بلکہ بیشتر خواتین نے خود کو مسلم لیگ کے لیے وقف کر دیا۔ سول نافرمانی کے دوران میں پنجاب ہی کی ایک نوجوان خاتون نے پنجاب سیکرٹریٹ سے انگریزوں کا جھنڈا یونین جیک اتار کر مسلم لیگ کا علم لہرا دیا۔

مسلم اقلیتی صوبے: مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان حصول پاکستان کی تحریک میں برابر کے شریک رہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اس جد و جہد میں ہراول دستے کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب 1940ء میں قرارداد

پاکستان پیش ہوئی تو سب سے پہلے اس کی تائید چودھری خلیق الزمان نے کی جو مسلم اقلیتی صوبے یو۔پی کے نمائندہ تھے۔ بعد ازاں بہار، مدراس، بمبئی اور سی۔پی کے نمائندوں نے اس کی پرزور حمایت کی۔ ان صوبوں کے مسلمان خوب جانتے تھے کہ ان کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے اور انہیں بدستور ہندوؤں کے تحت مصائب برداشت کرنا پڑیں گے مگر وہ خوش تھے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا قومی وطن بن رہا ہے اور ایک گوشہ ایسا ہوگا جہاں اسلامی معاشرہ قائم ہو سکے گا۔

46-1945ء کے انتخابات اس لیے بہت اہم تھے کہ وہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد پر لڑے گئے تھے۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کو مسلم اقلیتی صوبوں میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ بمبئی، اڑیسہ اور مدراس میں تو مسلم لیگ نے سو فی صد مسلم نشستیں حاصل کیں۔ ان واقعات سے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے ایثار و جذبۂ قربانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان صوبوں کے علما و مشائخ بھی تحریک پاکستان میں شامل تھے۔ 1937ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو ان کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ 1946ء میں بنارس کے مقام پر علما و مشائخ نے کانفرنس منعقد کی اور مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ نے آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی جس کا پہلا اجلاس 1937ء میں کلکتہ میں ہوا۔ ان طلبہ نے تحریک پاکستان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان صوبوں کی خواتین نے بھی دیگر صوبوں کی خواتین کی طرح قیامِ پاکستان کے لیے بھرپور کام کیا اور مسلم لیگ کی تنظیم نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

حصولِ پاکستان کی طرف قدم

مسلم حکومت اٹھارھویں صدی تک اپنے عروج پر رہی مگر انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی پر جنوبی ایشیا میں مسلم

اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا ۔ یہ دور مسلمانوں کے لیے مایوسیوں کا دور تھا ۔ ان پر مظالم کی انتہا ہو گئی ؛ اور وہ معاشی طور پر تباہ حال ہو گئے ۔ سرسید احمد خاں نے تعلیم کے ذریعے انھیں دوبارہ ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی کوشش کی ۔ انہوں نے علی گڑھ کالج قائم کیا ۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ایک بار پھر سنبھل گئے ۔

مسلم لیگ کا قیام اور اس کے اغراض و مقاصد : موجودہ صدی کے آغاز میں جنوبی ایشیا میں سیاسی بیداری ہو چکی تھی ۔ مغربی تعلیم اور پریس کی ترقی نے غیر ملکی حکومت سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا ۔ 1885ء میں مسٹر ہیوم نامی ایک انگریز نے کانگرس کی بنیاد ڈال دی تھی ۔ یہ سیاسی جماعت ہندوؤں کے حقوق کے لیے جد و جہد کر رہی تھی ۔ چنانچہ مسلم اکابرین نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بھی ایک سیاسی جماعت کا ہونا ضروری ہے ۔ مندرجہ ذیل واقعات نے اس ضرورت کا احساس اور زیادہ شدید کر دیا :

(i) ہندوؤں میں آریا سماج جیسی تحریکیں چل رہی تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی ایشیا میں مسلم تمدن کے تمام نقوش مٹا دیے جائیں ۔ وہ اردو زبان اور رسم الخط کے خلاف مہم چلا رہے تھے اور اس کے بجائے ہندی کو رائج کرنا چاہتے تھے ۔

(ii) ہندو گائے کے ذبیحہ پر پابندی عائد کرنا چاہتے تھے اور اس سوال پر کئی جگہ ہندو مسلم فسادات ہونے لگے ۔

(iii) ہندو ادب بالخصوص بنگالی ادب میں مسلم تمدن پر گھٹیا انداز میں کیچڑ اچھالا گیا ۔ ہندوؤں کا دعوٰی تھا کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے ۔ مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں یا وہ ہندومت قبول کر لیں یا ملک سے ہجرت کر جائیں ۔

(iv) بنگال کا صوبہ رقبہ و آبادی کے لحاظ سے بہت بڑا تھا ۔ 1905ء میں

اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ۔ یوں مشرق بنگال ایک بھاری اکثریت والا مسلم صوبہ بن گیا اور وہاں کے پسماندہ مسلمانوں کی ترقی کے امکانات روشن ہو گئے ۔ ہندو اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے تقسیم بنگال کے خلاف زبردست تحریک چلائی ۔ اس واقعہ نے بھی مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں ۔

(v) اسی زمانے میں حکومت برطانیہ نے جنوبی ایشیا میں آئینی اصلاحات نافذ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ۔ مسلم لیڈروں کو احساس ہوا کہ نئے آئین میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہونا چاہیے ، چنانچہ انھوں نے سر آغا خاں کی قیادت میں مسلمان زعما کا ایک وفد وائسرائے لارڈ منٹو کے پاس بھیجا ۔ یہ وفد شملہ کے مقام پر وائسرائے سے ملا اور اس نے حکومت برطانیہ سے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا ۔ وائسرائے سے ملاقات کے بعد مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ ایسے مطالبات منوانے کے لیے مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت قائم کی جائے ۔

دسمبر 1906ء میں جنوبی ایشیا کے مسلمان اکابرین بڑی تعداد میں ڈھاکہ کے مقام پر جمع ہوئے اور نواب وقار الملک کی صدارت میں وہ تاریخی جلسہ منعقد ہوا جس میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' قائم ہوئی ۔ سر آغا خاں کو اس کا پہلا صدر مقرر کیا گیا اور اس کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں قائم کیا گیا ۔

مسلم لیگ کے سامنے سب سے اہم مقصد برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی نگہداشت اور ان کی ضروریات و خواہشات کو حکومت کے سامنے پیش کرنا تھا ۔ اس کے علاوہ مسلمانوں اور ملک کی دوسری اقوام میں باہمی مفاہمت کی فضا پیدا کرنا نیز حکومت اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی اس کے مقاصد میں شامل تھے ۔

مسلم لیگ کی سب سے پہلی بڑی کامیابی یہ تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ

1909ء (جسے منٹو مارلے اصلاحات کا نام دیا جاتا ہے) میں جدا گانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا یعنی مسلمان اپنے حلقوں میں مسلم نمائندوں کا انتخاب کریں گے اور ہندو اپنے حلقوں میں ہندو نمائندے چنیں گے۔ یہی اصول پاکستان کی بنیاد بنا۔

میثاق لکھنؤ 1916ء: بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مسلم لیگ کی قیادت نوجوان طبقے کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ ان میں قائداعظم محمد علی جناح سب سے نمایاں تھے۔ انھوں نے کوشش کی کہ کانگرس اور مسلم لیگ مل کر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ملک کے آئینی ڈھانچے پر اتفاق ہو جائے۔ چنانچہ قائداعظم کی کوشش سے 1916ء میں لکھنؤ کے مقام پر مسلم لیگ اور کانگرس کا سالانہ اجلاس ایک ساتھ ہوا اور دونوں میں معاہدہ کے تحت طے پایا کہ:

(i) کانگرس جدا گانہ انتخاب کے طریق کو قبول کرے گی۔

(ii) مرکزی اسمبلی میں مسلم نمائندوں کی تعداد منتخب اراکین کی مجموعی تعداد کا ایک تہائی ہوگی۔

(iii) مسلم اکثریت کے صوبوں بنگال اور پنجاب میں مسلم نمائندوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے کچھ کم لیکن مسلم اقلیتی صوبوں میں ان کے نمائندوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ ہوگی۔

(iv) قانون سازی کے سلسلے میں کسی ایسی تجویز پر غور نہیں ہوگا، جس کی مخالفت اس قوم کے نمائندوں کی تین چوتھائی کرے۔

اس میثاق کی رو سے ہر صوبے میں مسلمان نمائندوں کی تعداد اتنی ہو گئی کہ اگر وہ کانگرس سے مل جاتے تو حکومت کو شکست ہو جاتی اور اگر وہ حکومت سے مل جاتے تو کانگرس کو شکست ہو جاتی۔ اس سے ان کی اہمیت بڑھ گئی۔

تحریکِ خلافت: پہلی جنگ عظیم (18ـ1914ء) میں ترکی کو اتحادیوں (برطانیہ اور اس کے ہمنوا) کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے اختتام پر اتحادیوں نے ترکی کی سلطنت کے حصے بخرے کرنا شروع کر دیے۔ اس پر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی کیونکہ وہ ترکی کی سلطنت اور خلافت عثمانیہ کو اتحادِ اسلامی کی علامت خیال کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک زبردست تحریک شروع کی جسے تحریکِ خلافت کہا جاتا ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ خلافت بحال رکھی جائے۔ سلطنت ترکیہ کی سالمیت کی ضمانت دی جائے۔ جب حکومت برطانیہ نے ان مطالبات پر توجہ نہ دی تو مسلمان مشتعل ہو گئے۔ انھوں نے عدم تعاون کا راستہ اختیار کیا۔ حکومت کے خطابات واپس کر دیے، سرکاری تقریبات، تعلیمی اداروں، عدالتوں اورغیر ملکی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جگہ جگہ جلسے منعقد ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ کئی مقامات پر پولیس سے جھڑپیں ہوئیں۔ مسلمان لیڈروں اور سیاسی کارکنوں کو قید میں ڈال دیا گیا۔

مسٹر گاندھی نے مسلمان زعما سے مشورہ کیے بغیر اچانک تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کے مقاصد کو نقصان پہنچا۔ دریں اثنا چونکہ خود کمال اتا ترک نے ترکی میں خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا، اس لیے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا جوش بھی سرد پڑ گیا۔

تحریک خلافت ایک زبردست عوامی تحریک تھی۔ مسلمانوں نے بڑے ایثار سے ہر قسم کے نقصانات برداشت کیے۔ اس تحریک نے مسلم عوام میں وہ سیاسی بیداری پیدا کی جس نے بعد میں تحریک پاکستان میں نشان راہ کا کام دیا۔ مسلمانانِ جنوبی ایشیا پر یہ بھی واضح ہوگیا کہ کانگرس اور ہندو مسلمانوں کے مفادات کا پاس نہیں رکھ سکتے۔

ہندو مسلم فسادات اور نہرو رپورٹ: تحریک خلافت کے دوران میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب آ گئے، مگر یہ ہندو، مسلم اتحاد عارضی ثابت ہوا اور تحریک خلافت کے خاتمے کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

دونوں قوموں کے اختلافات نے اس قدر شدت اختیار کی کہ ملک میں خونریز فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے - رہی سہی کسر نہرو رپورٹ نے پوری کر دی - موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تا کہ جنوبی ایشیا کے لیے ایسا آئینی ڈھانچہ تیار کیا جائے جو سب اقوام کے لیے قابل قبول ہو - جب 1928ء میں اس کمیٹی کی رپورٹ سامنے آئی تو مسلمان ہکا بکا رہ گئے کیونکہ اس رپورٹ میں ہندو اس معاہدہ سے بھی پھر گئے جو انھوں نے میثاق لکھنؤ کی صورت میں کیا تھا - جدا گانہ انتخاب کا اصول ختم کر دیا گیا اور مسلمانوں کے تمام تحفظات نظر انداز کر دیے گئے - نہرو رپورٹ سے عیاں ہو جاتا ہے کہ کانگرس اور ہندو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے مفادات کا مناسب تحفظ نہ کرتے تھے بلکہ وہ مسلمانوں کے مفادات کے منافی اقدام کرنے پر تلے ہوئے تھے - اس احساس نے مسلمانوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کیا -

چودہ نکات : مارچ 1929ء میں قائداعظم نے مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کیے اور واضح کیا کہ جب تک یہ شرائط پوری نہ ہوں ، مسلمانوں کے لیے کوئی آئین قابل قبول نہیں ہوگا :

1- ملک کا آئین وفاقی طرز کا ہو -

2- صوبوں کو خود اختیاری دی جائے -

3- ہر صوبے میں اقلیتوں کو مناسب نمائندگی دی جائے -

4- مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی سے کم نہ ہو -

5- جداگانہ انتخاب کا طریقہ اختیار کیا جائے -

6- صوبوں کی کوئی نئی حد بندی بنگال ، پنجاب اور صوبہ سرحد میں مسلم اکثریت کو متاثر نہ کرے -

7- تمام فرقوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو -

8۔ مجلس قانون ساز میں کوئی ایسا قانون منظور نہ ہو جس کی مخالفت اس فرقے کے نمائندوں کی تین چوتھائی تعداد کرے۔

9۔ سندھ کو صوبہ بمبئی سے الگ کر دیا جائے۔

10۔ باقی صوبوں کی طرح سرحد اور بلوچستان میں بھی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

11۔ تمام ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب حصہ دیا جائے۔

12۔ آئین میں مسلم تمدن، تعلیم، زبان، مذہب، شرعی قوانین اور خیراتی اداروں کو تحفظ دیا جائے۔

13۔ مرکز اور صوبوں کی کوئی ایسی وزارت قائم نہ کی جائے جس میں مسلم وزرا کل تعداد کا ایک تہائی نہ ہوں۔

14۔ صوبوں کی مرضی کے بغیر مرکزی اسمبلی آئین میں تبدیلی کرنے کی مجاز نہ ہو۔

اپنے ان چودہ نکات کے ذریعے قائداعظم نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو سب پر واضح کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی سوچ و عمل کے دھارے میں نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی جو جنوبی ایشیا کے سیاسی اُفق پر بعد میں رونما ہونے والے واقعات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

خطبہ الٰہ آباد: دسمبر 1930ء میں الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت علامہ اقبال نے کی جو اس وقت تک ایک مفکر اور مسلمان رہنما کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل کر چکے تھے۔ علامہ اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں مسلمانوں کی علحدہ قومیت کے نظریے پر تفصیلاً روشنی ڈالی اور اسلام کے سیاسی تصورات کو واضح کرتے ہوئے بتایا کہ مسلمان اپنے دین کامل اور اسلامی ثقافتی ورثے کی بدولت دیگر اقوام سے مختلف ہیں۔ آپ کے اس خطبہ صدارت کو برصغیر کے سیاسی اُفق کے حوالے سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آپ نے فرمایا:

"میری خواہش ہے کہ پنجاب ، صوبہ سرحد ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے ـــــ شمال مغربی مسلم ریاست کا قیام (برصغیر کے تمام مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی علاقوں کے مسلمانوں کا نوشتہ تقدیر ہے)۔"

علامہ اقبال کا یہ خطبہ مسلمانوں کے لیے روشنی کا ایسا مینار ثابت ہوا جس نے مسلمانوں کو نئی راہ دکھائی اور ایسی منزل کی نشاندہی کی جس کے بغیر ان کے مسائل کا حل ممکن نہ تھا۔

گول میز کانفرنسیں : ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اپنے تئیں آئندہ آئین کے متعلق اتفاق نہیں ہو سکا تھا ، اس لیے حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ جنوبی ایشیا میں آباد اہم قوموں کے نمائندوں پر مشتمل گول میز کانفرنس لندن میں منعقد کی جائے تا کہ باہمی گفت و شنید سے اختلافی مسائل طے ہو سکیں۔ 1930ء اور 1932ء کے درمیان ایسی تین کانفرنسیں منعقد ہوئیں لیکن وہ کسی متفقہ فیصلے پر نہ پہنچ سکیں۔ پہلی کانفرنس میں کانگرس نے شرکت سے انکار کر دیا۔ دوسری کانفرنس میں مسٹر گاندھی نے کانگرس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی لیکن انھوں نے مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح یہ کانفرنس بھی ناکام رہی۔ کانگرس کی اس ہٹ دھرمی سے مسلمان اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ اس مرحلہ پر مسلمانوں پر مزید واضح ہو گیا کہ ہندو اور ان کی جماعت کانگرس کسی صورت بھی کوئی ایسا فارمولا اپنانے کو تیار نہیں ، جس سے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ممکن ہو سکے ، یہی وجہ ہے کہ گول میز کانفرنسوں کے بعد کی مسلم سوچ اور سیاست میں ایک واضح تبدیلی پیدا ہوئی ، جو بالآخر قراردادِ پاکستان کو منظور کرنے اور بعد ازاں قیامِ پاکستان پر منتج ہوئی۔

قانون 1935ء اور کانگرسی وزارتیں : طویل عرصہ کی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر حکومت نے قانون مجریہ 1935ء منظور کر لیا جس کی رو سے مرکز میں

دو عملی نظام قائم کرنے کی تجویز تھی - صوبوں کو خود اختیاری دے دی گئی اور صوبائی محکمے وزرا کے سپرد کر دیے گئے - مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے یہ امر قابلِ اطمینان تھا کہ ان کی زبردست مہم کے نتیجے میں اب سندھ کو صوبہ بمبئی سے الگ کرکے مکمل صوبے کا درجہ دے دیا گیا تھا ، نیز سرحد میں دیگر صوبوں کی طرح سیاسی اصلاحات نافذ کر دی گئی تھیں -

قانون 1935ء کا وہ حصہ جو مرکز سے متعلق تھا ، عملی جامہ نہ پہن سکا ، البتہ صوبائی حصے کا نفاذ عمل میں آیا اور 1937ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے - ابھی تک مسلم لیگ اس کوشش میں تھی کہ برصغیر کے عظیم تر مفاد کے پیش نظر کانگرس کے ساتھ سمجھوتہ ہو جائے ، چنانچہ ان انتخابات میں بھی مسلم لیگ نے کانگرس سے اشتراک کیا -

انتخابات کے بعد کانگرس نے گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں وزارتیں قائم کر لیں - مسلم لیگ کو بجا طور پر توقع تھی کہ کانگرس اسے بھی وزارت میں شریک کرے گی مگر کامیابی کے بعد کانگرس کی مخصوص ہندو ذہنیت آشکارہ ہو گئی - اس نے کہا کہ صرف اسی صورت میں مسلم لیگ کو حکومت میں شریک کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ جماعتی حیثیت ختم کر دے اور کانگرس میں مدغم ہو جائے - کانگرس کی ہوسِ اقتدار کا یہ عالم تھا کہ جہاں اسے اکثریت حاصل تھی ، وہاں کسی کو ساتھ ملانے کے لیے تیار نہ تھی ، لیکن جہاں اس کی تعداد زیادہ نہ تھی ، وہاں اس نے دوسری جماعتوں سے مل کر وزارت قائم کی - یہ دوسری صورت صوبہ سرحد اور آسام میں پیش آئی -

کانگرس اقتدار کے نشے میں چور تھی - اس نے ایسے اقدامات شروع کیے جن سے مسلمانوں کو سخت ٹھیس پہنچی - اس نے بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا حالانکہ یہ گیت ایک ایسی کتاب سے ماخوذ تھا جو سراسر مسلم دشمنی پر مبنی تھی - یو - پی میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں بہتر مقام حاصل تھا - کانگرسی حکومت اسے ختم کرنے کے درپے ہو گئی اور مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے بند کیے جانے لگے - کانگرس کے کارکن ہر جگہ نظم و

نسق میں مداخلت کرنے لگے اور ان کے زیر اثر تھانوں و عدالتوں میں ظلم و ستم شروع ہوا - اردو کو ختم کر کے ہندی کو فروغ دیا جانے لگا ، یہاں تک کہ سی - پی میں جو تعلیمی منصوبہ نافذ ہوا ، اس کا نام ہی ''ودیامندر'' رکھا گیا - اسکولوں میں مسلمان بچوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ بندے ماترم گائیں اور مسٹر گاندھی کی تصویر کی پوجا کریں -

کانگرس کے اس متکبرانہ اور متعصبانہ طرز عمل نے مسلمانوں کو اس سے مکمل طرز پر مایوس کر دیا - ہندو راج کے اس تلخ تجربے نے مسلمانوں کو متحد کر دیا - یوں وہ ان کے لیے ایک نعمت ثابت ہوا - مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے اور یہ جماعت دیکھتے ہی دیکھتے زبردست عوامی تحریک بن گئی - قائداعظم کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا - اس سیاسی فضا میں سندھ مسلم لیگ نے 1938ء میں وہ قرارداد منظور کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ، وہاں مسلم حکومت قائم کی جائے - گویا اب مسلمانوں نے محض آئینی تحفظات حاصل کرنے کے بجائے آزاد مملکت کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا -

دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر جب کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں تو مسلم لیگ نے سارے ملک میں دسمبر 1939ء میں یوم نجات منایا -

مسلم لیگ کی عوامی تحریک اور قیام پاکستان

قراردادِ پاکستان 1940ء : مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 1939ء میں اپنے اجلاس میرٹھ کے دوران ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ وہ مختلف آئینی تجاویز پر غور کرے - اس کمیٹی کے صدر قائداعظم تھے - کمیٹی نے کافی غور کے بعد بالآخر 23 مارچ 1940ء کو اجلاس لاہور میں وہ مشہور و معروف قرارداد پیش کی جسے قرارداد لاہور یا قرارداد پاکستان کہا جاتا ہے - اس کے الفاظ یہ تھے :

"اس ملک میں کوئی دستوری خاکہ اس وقت تک قابل عمل یا مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا جب تک وہ مندرجہ ذیل اصول پر مرتب نہ کیا جائے، یعنی جغرافیائی اعتبار سے متصلہ علاقے الگ خطے بنا دیے جائیں اور جو علاقائی ترمیمیں ضروری سمجھی جائیں۔ کر لی جائیں تا کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں جن علاقوں کے اندر مسلمانوں کو از روئے آبادی اکثریت حاصل ہے، وہ یک جا ہو کر ایسی آزاد ریاستیں بن جائیں جن کے اجزائے ترکیبی خود مختار اور مقتدر ہوں"۔

اس قرارداد کا منظور ہونا تھا کہ کانگرسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہندو پریس میں اس کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ دوسری طرف مسلم لیگ کی حکمت عملی میں اب کوئی ابہام باقی نہ رہا۔ اس کا لائحہ عمل بالکل صاف تھا یعنی یہ کہ تمام مسائل کا واحد حل برصغیر کی تقسیم ہے۔ آزاد مسلم ریاست کا تصور عوام کے لیے اس قدر خوش آئند تھا کہ ان میں جوش و خروش کی انتہا نہ رہی اور اتحاد و تنظیم کے جذبات کی فراوانی پیدا ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ خواب ایک حقیقت بن گیا۔

کرپس کی تجاویز 1942ء : جنگ عظیم دوم کے ابتدائی مراحل میں برطانیہ کو کئی شکستوں کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ جاپانی افواج برما میں پہنچ گئیں۔ اس پر حکومت برطانیہ نے جنوبی ایشیا کے باشندوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے سرسٹیفورڈ کرپس کو چند تجاویز کے ساتھ یہاں بھیجا۔ ان میں کہا گیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر جنوبی ایشیا کو آزادی دے دی جائے گی۔ نیا آئین وفاقی طرز کا ہوگا جس میں اقلیتوں کے حقوق کی نگہداشت کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہیں تو الگ وفاق بنا لیں۔ حکومت ملک کی مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو فوری طور پر امور سلطنت میں شامل کرنے کو تیار تھی۔

کانگرس ان تجاویز سے اس لیے ناخوش تھی کہ ان میں صوبوں کو الگ وفاق بنانے کا اختیار دے کر قیامِ پاکستان کا امکان پیدا کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ حکومت میں اپنے علاوہ دوسری جماعتوں کے نمائندوں کی شمولیت بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ سے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ پاکستان کا امکان پیدا ہو گیا تھا مگر وہ اس لیے ناخوش تھی کہ پاکستان کو واضح طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ بہرحال کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنی اپنی وجوہ کی بنا پر تجاویز کو مسترد کر دیا۔

ہندوستان چھوڑ دو تحریک اور گاندھی جناح مذاکرات: کرپس کی واپسی پر کانگرس نے حکومت کے خلاف بغاوت کا پروگرام بنایا اور اسے ''ہندوستان چھوڑ دو تحریک'' کا نام دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت دباؤ میں آ کر کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور مسلم لیگ کی پروا کیے بغیر اقتدار اس کے حوالے کر دے۔ اس تحریک سے عام بغاوت پھیلی۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑی گئیں، تار کاٹے گئے اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ تاہم حکومت نے کانگرسی لیڈروں کو قید کر دیا اور بغاوت کچل دی۔ اس تحریک میں مسلم لیگ نے کانگرس کا ساتھ نہ دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہ ہوگی جب تک مسلمان اس میں شامل نہ ہوں۔

1944ء میں مسٹر گاندھی جیل سے رہا ہوئے تو انھوں نے قائداعظم سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا مگر ان مذاکرات کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، اس لیے کہ مسٹر گاندھی مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔

شملہ کانفرنس اور انتخابات: 1945ء میں جنگ کی صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ برطانیہ کو اپنی فتح کا یقین ہو گیا تھا، چنانچہ وائسرائے لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ وائسرائے کی انتظامیہ کونسل تمام تر ہندوستانی اراکین پر مشتمل ہوگی اور اس میں تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندے اس تناسب سے شامل ہوں گے کہ مسلمانوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی تعداد برابر ہوگی۔

ان تجاویز پر غور کرنے کے لیے جون 1945ء میں شملہ کے مقام پر کانفرنس منعقد ہوئی ۔ کونسل میں پانچ مسلم اراکین شامل کرنے کی تجویز تھی۔ کانگرس کا اصرار تھا کہ ان میں سے کم از کم ایک مسلم نمائندہ وہ نامزد کرے گی ۔ مگر قائداعظم نے واضح کر دیا کہ پانچوں مسلم ارکان کو صرف مسلم لیگ نامزد کر سکتی ہے کیونکہ وہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے ۔ اس نکتہ پر یہ کانفرنس ناکام ہوگئی ۔

شملہ کانفرنس میں یہ فیصلہ نہیں ہو سکا تھا کہ آیا مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے یا نہیں ، چنانچہ اس کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا گیا ۔ 1945-46ء کے موسم سرما میں عام انتخابات منعقد کرائے گئے ۔ ان میں مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی تمام کی تمام تیس مسلم نشستیں حاصل کر لیں جبکہ صوبوں میں قریباً 90 فی صد مسلم نشستیں حاصل کیں ۔ یوں اس کا یہ دعویٰ ثابت ہوگیا کہ وہی مسلمانوں کی اصل نمائندہ جماعت ہے اور کسی بھی سیاسی تصفیے میں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

قرارداد 1946ء : اپریل 1946ء میں قائداعظم نے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے تمام تر مسلم لیگی ارکان کا ایک کنونشن دہلی میں بلایا ۔ اس میں حسین شہید سہروردی نے ایک قرارداد پیش کی جس کی رو سے شمال مغرب اور شمال مشرق کے مسلم اکثریتی علاقوں پر ایک آزاد مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا ۔ یوں قراردادِ پاکستان میں ایک ترمیم منظور کر لی گئی ۔

کابینہ مشن منصوبہ : 1945ء میں انگلستان میں لیبر پارٹی کی حکومت برسرِ اقتدار آئی تو اس نے مارچ 1946ء میں اپنی کابینہ کے تین ارکان پر مشتمل ایک مشن جنوبی ایشیا روانہ کیا ۔ اس مشن نے کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کی مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا ۔ اس پر اس نے 16 مئی 1946ء کو اپنی طرف سے ایک منصوبے کا اعلان کیا جس کے نمایاں پہلو یہ تھے :

(i) برصغیر کی یونین قائم کی جائے گی جو امور خارجہ، دفاع اور رسل و رسائل کی ذمہ دار ہوگی۔

(ii) مذکورہ مرکزی شعبوں کے علاوہ تمام شعبے صوبوں کے سپرد ہوں گے۔

(iii) صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ باہم گروپ بنا لیں اور ہر گروپ اپنا دستور مرتب کرے۔

(iv) ہر دس سال کے بعد صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ کثرتِ رائے سے آئین میں تبدیلی کا مطالبہ کر سکیں۔

جنوبی ایشیا کو تین گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ گروپ الف میں یو۔پی، بہار، اڑیسہ، سی۔پی، بمبئی اور مدراس تھے، گروپ ب میں پنجاب، سندھ اور سرحد۔ گروپ ج میں بنگال اور آسام کے صوبے شامل تھے۔ اس طرح یہ سہ گانہ وفاق کا ایک انوکھا منصوبہ تھا۔

عبوری حکومت: کابینہ مشن میں یہ بات شامل تھی کہ جو جماعت اسے تسلیم کرے گی، اسے حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی، مگر برطانیہ کی لیبر حکومت کانگرس کی طرف واضح جھکاؤ رکھتی تھی اور اسے ہر حالت میں خوش رکھنا چاہتی تھی، اس لیے اس نے سازش کے تحت مسلم لیگ کو حکومت سے الگ رکھا اور کانگرس نے عبوری حکومت بنا لی۔ اس بد عہدی پر ملک میں بے چینی پھیل گئی اور ہنگامہ آرائی و فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔

اب وائسرائے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے مسلم لیگ سے حکومت میں شمولیت کی درخواست کی۔ یہ حکومت چودہ وزرا پر مشتمل تھی۔ چھے کانگرس کے، پانچ مسلم لیگ کے اور تین وائسرائے کے نامزد تھے، مگر اس حکومت کے اندر اتنے شدید اختلافات تھے کہ عبوری حکومت ناکام ہو گئی۔

ماؤنٹ بیٹن کی آمد اور برصغیر کی تقسیم: مارچ 1947ء میں لارڈ ویول کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے بن کر آیا۔ اس کا

رویہ شروع سے کانگرس کے حق میں دوستانہ اور مسلم لیگ کے بارے میں غیر دوستانہ تھا ۔ تاہم ہندو اور مسلمان زعما سے بات چیت کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ملک کی تقسیم کے بغیر کوئی اور چارہ کار نہیں ۔ چنانچہ اس نے 3 جون 1947ء کو اپنے منصوبے کا اعلان کیا ۔ اس کی رو سے طے پایا کہ برصغیر کو دو الگ الگ مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے گا جنھیں شروع میں نو آبادیاتی حیثیت حاصل ہوگی ، پنجاب اور بنگال کو دو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ۔ اس کام کے لیے دو حد بندی کمیشن قائم کیے جائیں گے ۔ سرحد اور سلہٹ میں استصواب کرایا جائے گا ۔ سندھ اور آسام کی اسمبلیاں اپنے صوبوں کے مستقبل کا فیصلہ کریں گی ۔ ریاستیں جس ملک میں چاہیں شامل ہو سکتی ہیں :

اس منصوبے کو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے بادلِ نخواستہ قبول کیا ۔ یوں آخر کار 14 اگست 1947ء کو ایک صبر آزما سیاسی جد و جہد ، یقین محکم اور عمل پیہم سے دنیا کی عظیم مسلم مملکت پاکستان عالمِ وجود میں آئی ۔

سوالات

(الف) 1۔ اسلام سے پہلے جنوبی ایشیا کی سماجی حالت مختصراً بیان کریں ۔ اس میں ذات پات کا نظام کس طرح معاشرتی ناہمواری پیدا کرتا تھا ۔

2۔ اسلام جنوبی ایشیا کے رہنے والوں پر سیاسی ، معاشرتی ، تمدنی اور مذہبی لحاظ سے کس طرح اثر انداز ہوا ؟

3۔ نظریہ پاکستان سے کیا مراد ہے ؟ تاریخی اعتبار سے اس کا جائزہ لیں ۔

4۔ قائداعظم کے فرامین کی روشنی میں نظریہ پاکستان کی وضاحت کریں ۔

5۔ مندرجہ ذیل علاقوں میں جد و جہد آزادی کا اجمالی جائزہ پیش کریں ۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ ، بلوچستان ، سندھ ، پنجاب ، مسلم اقلیتی صوبے ۔

6۔ 1857ء سے قیامِ پاکستان تک کے واقعات نظریہ پاکستان کے تاریخی سفر کی ایک اہم کڑی تھے ، وضاحت کریں ۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کا ہاں یا نہ میں جواب دیں :

1۔ اسلام سے پہلے جنوبی ایشیا کے معاشرے میں برہمن ملک و قوم کے دفاع اور امن و امان کے ذمے دار تھے ۔

2۔ جنوبی ایشیا میں قبل از اسلام معاشرے میں عورت کو بڑا مقام حاصل تھا ۔

3۔ مسلمانوں نے جنوبی ایشیا میں اعلیٰ نظام حکومت کی بنیاد ڈالی ۔

4۔ مسلمانوں کی جنوبی ایشیا میں آمد سے پہلے ہندو لباس کے معاملے میں سلیقہ مند نہ تھے ۔

5۔ جنوبی ایشیا میں مسلم سلاطین کے زیر سایہ علم و ادب نے بڑی ترقی کی ۔

6۔ سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگوں کا مرکز اُچ شریف تھا ۔

7۔ سندھ کو باب الاسلام کہتے ہیں ۔

8۔ قرارداد پاکستان 23 مارچ 1940ء کو پیش کی گئی ۔

(ج) خالی جگہ پُر کریں :

1۔ جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جو نیا آرٹ پیدا ہوا اسے ـــــ کہتے ہیں ۔ (اسلامک آرٹ ، گندھارا آرٹ ، انڈو اسلامک آرٹ) ۔

2۔ قائداعظم نے ـــــ میں صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کرنے کا مطالبہ پیش کیا۔(1934ء ، 1927ء ، 1913ء) ۔

3۔ مسلم لیگ ـــــ میں قائم کی گئی۔(1905ء ، 1906ء ، 1911ء) ۔

4۔ علامہ اقبال کے ـــــ نے مسلمانوں کو نئی راہ دکھائی اور اس پر گامزن ہو کر قیامِ پاکستان عمل میں آیا۔(خطبہٴ الٰہ آباد ، خطباتِ مدراس) ۔

5۔ ـــــ میں قراردادِ لاہور پیش کی گئی۔(1935ء ، 1940ء ، 1946ء)۔

6۔ 1945ء میں انگلستان میں ـــــ برسراقتدار آئی تو اس نے اپنی کابینہ کے تین ارکان پر مشتمل ایک مشن جنوبی ایشیا روانہ کیا ۔ (لیبر پارٹی ، کنزرویٹو پارٹی ، لبرل پارٹی) ۔

7۔ 3 جون 1947ء کو ـــــ نے برصغیر کو دو الگ الگ مملکتوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا۔

(ماؤنٹ بیٹن ، کرپس ، سائمن)

۲

تاریخ پاکستان

دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کا قیام بیسویں صدی کا ایک نہایت اہم اور عظیم واقعہ ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کا بلاشبہ یہ غیر فانی کارنامہ ہے کہ انھوں نے دنیا کے کسی بھی حصے میں بسنے والے مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد کو منظم و متحد کرکے ایک قوم کی تشکیل کی اور ایک علاحدہ آزاد مملکت قائم کی جس میں اسلامی اقدار کی ترویج کے لیے ایک مشن کا آغاز کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم (1939ء تا 1945ء) نے انگریزوں کے عالمی اقتدار کو کمزور کر دیا تھا۔ برطانوی ہندوستان کے عوام میں آزاد و خود مختار ہونے کا عزم بھی روز بروز بڑھتا جا رہا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر انگریز برطانوی ہند کو آزادی دینے کے بعد اسے چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ برطانوی عہد میں مسلمانانِ برصغیر کی سیاست کا نمایاں پہلو یہ رہا ہے کہ انھوں نے اپنی الگ سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے جد و جہد جاری رکھی۔ اس سلسلے میں جن زعما نے خاص طور سے خدمات سرانجام دیں، ان میں سرسید احمد خاں، نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، سید امیر علی، سر آغا خاں سوم، چودھری رحمت علی، علامہ اقبال اور قائداعظم کے نام ہمیشہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے

جائیں گے۔ برطانوی ہند میں انگریزوں نے جمہوریت کے نام پر حکومت کے جو اصول وضع کر رکھے تھے، وہ ہندو اکثریت کے لیے تو نہایت سازگار تھے، مگر مسلمانوں کو ان سے قطعاً کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس 'مغربی جمہوریت' کے نفاذ کا مطلب یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان، ہندو اکثریت کے ابدی غلام بن کر رہ جائیں، مگر مسلمان جنھوں نے اسی برصغیر پر ساڑھے چھے سو سال تک شان و شوکت سے حکومت کی تھی، اس صورت حال کو قبول کرنے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔

23 مارچ 1940ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں قراردادِ لاہور متفقہ طور پر منظور ہوئی جو بعد میں قراردادِ پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند کو اس وقت تک برصغیر کا کوئی سیاسی حل قابل قبول نہیں ہوگا جب تک کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلم اکثریت والے جغرافیائی لحاظ سے ملحقہ علاقے ملا کر مسلمانوں کے لیے ایسی آزاد ریاستیں نہ بن جائیں جن کے اجزائے ترکیبی خود مختار اور صاحبِ اقتدار ہوں۔ اس طرح مسلمانانِ ہند نے قائداعظم کی قیادت میں اپنے لیے ایک واضح نصب العین متعین کر لیا۔

دورانِ جنگ برطانوی حکومت نے اس ارادے کا اظہار شروع کر دیا تھا کہ وہ جنگ کے فوری بعد برصغیر کو خود مختاری دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اگست 1940ء میں وائسرائے ہند نے ایک اعلان کیا کہ ایک دفاعی مشاورتی کونسل قائم کی جائے گی جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو نمائندگی دی جائے گی، نیز کوئی ایسا دستور نہیں بنایا جائے گا جسے ملک کا کوئی بڑا طبقہ منظور نہ کرے۔ مارچ 1942ء میں برطانوی کابینہ کا ایک وزیر سر اسٹیفورڈ کرپس اپنی حکومت کی طرف سے ایک پیش کش لے کر آیا، مگر کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ جون 1945ء میں لارڈ ویول وائسرائے ہند نے برطانوی حکومت کی جانب سے متحدہ ہندوستان کی سیاسی

پارٹیوں پر مشتمل ایک عارضی حکومت کے قیام کی پیش کش کی جس میں دفاع کے علاوہ تمام شعبے ہندوستانی ممبروں کے پاس ہوں گے ، لیکن اس منصوبے کو بھی مسلم لیگ اور کانگرس نے نامنظور کر دیا۔

اس وقت متحدہ ہندوستان کی دو بڑی اور اہم سیاسی جماعتیں مسلم لیگ اور کانگرس تھیں۔ کانگرس بنیادی اور عملی طور پر ہندوؤں کی جماعت تھی جب کہ وہ ہندوستان کے تمام فرقوں اور قوموں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعوٰی کرتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہمیشہ کانگرس سے علیحدہ رہی اور یہ کہ صرف مسلم لیگ کو ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کہلانے کا حق تھا۔ چنانچہ قائداعظم نے کانگرس کے اس دعوٰی کو چیلنج کیا اور اعلان کیا کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو ہے۔ قائداعظم کے قول کی تصدیق 1945-46ء کے موسم سرما میں ہونے والے مرکزی اور صوبائی انتخابات کے نتائج نے بھی کر دی۔ مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی تمام کی تمام مسلم نشستیں بھاری اکثریت سے جیت لیں اور صوبوں میں مسلمانوں کی مخصوص نشستوں کی قریباً 90 فی صد نشستیں حاصل کرکے یہ ثابت کر دیا کہ متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی صرف اور صرف مسلم لیگ ہی کرتی ہے۔

مارچ 1946ء میں برطانوی کابینہ کے تین وزرا پر مشتمل ایک وفد جسے کیبنٹ مشن کہتے ہیں ، ہندوستان آیا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے ساتھ بات چیت کے بعد وفد نے اپنا منصوبہ دونوں سیاسی جماعتوں کو پیش کیا اور کہا کہ یا تو اسے مکمل طور پر قبول کر لیں یا پھر اسے مسترد کر دیں۔ مذکورہ منصوبے میں مزید درج تھا کہ جو سیاسی جماعت اسے کلی طور پر قبول کرے گی ، اسے عارضی حکومت بنانے کی پیش کش کی جائے گی جب تک کہ تمام سیاسی جماعتوں کے لیے قابلِ قبول آئین نہ بن جائے۔ مسلم لیگ نے اس منصوبے کو قبول کر لیا مگر کانگرس نے اسے مسترد کر دیا۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس صورت میں مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت

دی جاتی مگر وائسرائے نے کانگرس سے ساز باز کر کے کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دی ۔ یہ صریحاً بے اصولی اور جانبداری تھی لہٰذا مسلم لیگ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور وزارتی وفد کے منصوبے کو مسترد کر دیا ۔ بعد میں وائسرائے ویول کی درخواست پر اور مسلمانانِ ہند کے مفادات کے تحفظ کی خاطر مسلم لیگ نے بھی عبوری حکومت میں شمولیت کر لی مگر آزادی کا مسئلہ بدستور تعطل کا شکار رہا ۔

جنگ کے خاتمہ کے بعد برطانیہ میں لارڈ ایٹلی کے زیر قیادت لیبر پارٹی برسراقتدار آئی ۔ لیبر پارٹی اور کانگرس کے مابین دوستانہ مراسم پہلے سے تھے ، کیونکہ لیبر پارٹی ، کانگرس کی ہم خیال تھی اور ہندوستان کی تقسیم کی مخالف تھی ۔ مگر 46_1945ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی شاندار کامیابی کے پیش نظر لیبر پارٹی بھی تقسیم برصغیر پر راضی ہوگئی ۔ ان حالات میں ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن 22 مارچ 1947ء کو ہندوستان پہنچے ۔ ہندوستان پہنچتے ہی انھوں نے سب سے پہلے کانگرسی لیڈروں سے تبادلۂ خیالات کیا اور بعد میں قائداعظم سے ملاقات کی ۔ لارڈ ایٹلی نے اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ جون 1948ء تک بہر صورت اقتدار ہندوستان کو منتقل کر دینا چاہتی ہے ۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سیاسی تعطل کا جو حل تلاش کیا وہ کانگرس کے لیے تو بہت سود مند ثابت ہوا مگر اس سے مسلم لیگ اور مسلمانانِ ہند کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وائسرائے کی تقرری سے پیشتر ہی ماؤنٹ بیٹن کے نہرو خاندان سے گہرے تعلقات تھے جب کہ اس کے برعکس قائداعظم کے ساتھ اس کے تعلقات ابتدا ہی سے رسمی بلکہ تعصبانہ تھے ۔ ہندو اور انگریز قائداعظم کو اس لیے بھی ناپسند کرتے تھے کہ وہ کانگرس اور انگریزوں کی چالوں اور حیلہ سازیوں کے باوجود مطالبہ پاکستان کے بارے میں اپنے مؤقف پر ڈٹے ہوئے تھے ۔ قائداعظم نے اپنی ولولہ انگیز قیادت سے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط بنا دیا تھا ، یہاں تک کہ برصغیر کے کروڑوں مسلمان

پاکستان کے حصول کے لیے ہر ایثار و قربانی کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ ان حالات میں وائسرائے نے 3 جون 1947ء کو ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا۔ ایک تحقیق کے مطابق ماؤنٹ بیٹن نے اس منصوبے کی منظوری خفیہ طور پر پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں سے پہلے ہی سے حاصل کر لی تھی، جب کہ مسلمان زعما کو اس سلسلے میں بے خبر رکھا گیا۔ اس منصوبے کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1۔ متحدہ ہندوستان کو دو حصوں میں (پاکستان اور بھارت) میں تقسیم کر دیا جائے۔

2۔ پنجاب اور بنگال کے صوبوں کی اسمبلیوں کے غیر مسلم ممبران کی اکثریت اگر علٰحدگی کا فیصلہ کر لے تو ان صوبوں کو تقسیم کر دیا جائے۔

3۔ سندھ اسمبلی کے اراکین فیصلہ کریں گے کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔

4۔ صوبہ سرحد میں استصواب رائے سے فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ صوبہ پاکستان میں شامل ہو یا بھارت میں۔

5۔ آسام کے مسلم اکثریت کے ضلع سلہٹ کے مستقبل کا فیصلہ بھی استصواب رائے سے ہو گا۔

6۔ بلوچستان کے شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری اراکین کو بھی حق دیا جائے گا کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کس کے ساتھ شمولیت چاہتے ہیں۔

7۔ اگر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہو تو سرحدوں کے تعین کے لیے باؤنڈری کمیشن مقرر کیے جائیں۔

8۔ شاہی ریاستیں Princely States کیبنٹ مشن پلان (1946ء) کے اعلان کے مطابق اپنے مخصوص حالات اور جغرافیائی حیثیت کی روشنی میں

کسی ایک مملکت میں شمولیت کا فیصلہ کریں گی۔

9۔ حکومت برطانیہ جون 1948ء سے پہلے ہی اقتدار ہندوستانیوں کو دینا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں وائسرائے نے اعلان کیا کہ اقتدار 15 اگست 1947ء تک منتقل کر دیا جائے گا۔

اگرچہ ماؤنٹ بیٹن کے اس منصوبے کی وجہ سے پاکستان کو سخت نقصان پہنچا پھر بھی یہ مسلم لیگ کی فتح تھی کہ حکومتِ برطانیہ نے متحدہ ہندوستان کی تقسیم کا اصول مان لیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے 9 جون 1947ء کو منظور کی گئی ایک قرارداد میں کہا گیا کہ اگرچہ مسلم لیگ کی کونسل پنجاب اور بنگال کی تقسیم اصولی طور پر قبول نہیں کرتی، تاہم وہ اس منصوبے کے بنیادی اصولوں کو مصالحت کے طور پر قبول کرتی ہے۔

3 جون 1947ء کے منصوبے کی رو سے صوبہ سرحد اور سلہٹ میں استصواب رائے نیز بلوچستان میں شاہی جرگے اور کوئٹہ میونسپلٹی کی مطلوبہ رائے مسلم لیگ کے لیے ایک چیلنج تھا۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کیا جس سے وہ بطریق احسن سرخرو ہوئے۔ ان علاقوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

18 جولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے منصوبہ تقسیم ہند کو منظور کرکے اسے قانون بنا دیا جو قانون آزادی ہند 1947ء کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے 15 اگست 1947ء کو پاکستان اور بھارت کی آزاد مملکتیں قائم کرنا قرار پائیں جنھیں نو آبادیاتی درجہ حاصل ہوگا، نیز برطانوی ہند پر برطانوی راج ختم ہو جائے گا۔

قانون آزادی ہند 1947ء کی اہم دفعات کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے:

1۔ برطانوی ہند کو دو آزاد ریاستوں (Sovereign States) میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

2۔ برطانوی حکومت کی ان دونوں ممالک کے کسی حصے اور کسی معاملے

بر عمل داری نہیں رہے گی ۔ دونوں ممالک کے قانون ساز اداروں کو اپنے اپنے ملک میں قانون سازی کے مکمل اور جامع اختیارات ہوں گے ۔

3۔ جب تک دونوں ممالک اپنے آئین تشکیل نہیں پاتے، حکومت کا نظام حکومت ہند کے قانون مجریہ 1935ء کے تحت چلایا جائے گا ۔ اس میں قانون آزادی ہند 1947ء کی روشنی میں ضروری ترامیم کی جا سکیں گی ۔

4۔ 31 مارچ 1948ء تک ہر دو ممالک کے اپنے اپنے گورنر جنرل کو اپنے اپنے ملک میں ضروری ترامیم کا حق حاصل رہے گا ۔ اس کے بعد دونوں ممالک کی مقننہ جات بھی اس کو جاری رکھنے یا اس میں ترمیم کا حق رکھیں گی ۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ آزادی سے قبل ہندوستان کی کسی مقننہ یا عہدے دار کو حکومت ہند کے قانون مجریہ 1935ء میں ترمیم کا حق حاصل نہیں تھا ۔ صرف برطانوی پارلیمنٹ ہی ایسا کر سکتی تھی ۔

5۔ تاج برطانیہ کو یہ حق نہیں ہوگا کہ بھارت یا پاکستان کی مقننہ جات کے منظور کردہ قوانین کو نامنظور کر دے ۔ یہ اختیار صرف متعلقہ گورنر جنرل کو حاصل ہوگا ۔

6۔ حکومت برطانیہ اور شاہی ریاستوں (Princely States) کے حکمرانوں کے درمیان کیے گئے معاہدے منسوخ ہو جائیں گے ۔ اب یہ ریاستیں اپنے تعلقات متعلقہ مملکت سے گفت و شنید سے طے کریں گی ۔

7۔ برطانیہ کے بادشاہ کے خطابات سے 'شہنشاہ ہند' کا خطاب ختم کر دیا گیا ۔

اس قانون کے تحت قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے ۔

ریڈ کلف ایوارڈ اور اس کی ناانصافی : 3 جون 1947ء کے منصوبے کے تحت پنجاب اور بنگال کی قانون ساز اسمبلیوں نے ان صوبوں کی تقسیم کے حق میں

فیصلہ دیا ، لہٰذا وائسرائے نے بنگال اور پنجاب کے لیے دو باؤنڈری کمیشن 30 جون 1947ء کو مقرر کیے ۔ ان دونوں کمشنوں کا مشترکہ صدر سر سیرل ریڈ کلف ایک برطانوی وکیل مقرر کیا گیا ۔

دونوں مملکتوں کے مابین حد بندی کا کام نہایت اہم اور نازک نوعیت کا تھا ، اس لیے قائداعظم نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ کام اقوام متحدہ کی نگرانی میں کسی غیر جانبدار ادارے کے سپرد ہونا چاہیے لیکن کانگرس نے اسے منظور نہ کیا ۔ اس کے بعد قائداعظم نے یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ کی پریوی کونسل (Privy Council) کے ججوں کے ذریعہ حد بندی کا کام کروایا جائے ، لیکن اس بار ماؤنٹ بیٹن نے کانگرس کا کردار ادا کیا اور اس تجویز سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اسے نامنظور کر دیا ۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو سے منصوبے کا اعلان کرتے وقت پاکستان کی جو جغرافیائی حدود بیان کی تھیں ، ان کی رو سے مکمل آسام کے علاوہ مشرقی پنجاب کے علاقے گورداسپور ، فیروز پور اور جالندھر کے مسلم اکثریت والے اضلاع کی پاکستان میں شمولیت کا ہر ممکن امکان تھا ، مگر ریڈکلف نے حد بندی کے کام میں انصاف کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صریحاً جانبداری سے کام لیا اور پاکستان کو بعض انتہائی اہم علاقوں سے محروم کر دیا ۔ یہ فیصلہ ریڈکلف ایوارڈ کے نام سے مشہور ہے ۔ اس سے پاکستان کے لیے ایسے مسائل پیدا ہو گئے جو آج تک اس کی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹ بنے ہوئے ہیں ۔

پنجاب کی حد بندی میں ریڈ کلف نے مسلم اکثریت کی تحصیلیں، گورداسپور، بٹالہ ، فیروز پور اور زیرہ بھارت میں شامل کر دیں ۔ اسی طرح ایک انتہائی گہری سازش کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو بعد میں بھارت سے ملانے کے لیے گورداسپور کے ذریعے راستہ مہیا کیا گیا اور یوں کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کی راہ ہموار کی گئی ۔ مغربی پنجاب کی کئی نہروں کے ہیڈ ورکس بھارت کو دے دیے گئے اور یوں نہری پانی کا مسئلہ پیدا کیا ۔ بنگال کی

حد بندی کے ایوارڈ میں کلکتہ کا شہر اور ہندرگاہ، ضلع مرشد آباد اور ندیہ کے علاقے بھارت میں شامل کر دیے۔

ریڈ کلف ایوارڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا "یہ ایوارڈ غیر منصفانہ، ناقابل فہم بلکہ غیر معقول ہے۔ چونکہ میں اس پر عمل کرنے کا عہد کر چکا ہوں، اس لیے یہ ہم پر لازم ہے۔" ریڈکلف ایوارڈ کو قانونی فیصلہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا۔

پاکستان کے ابتدائی مسائل

انتظامی امور : بھارت نے شروع ہی سے پاکستان کے لیے لاتعداد مسائل کھڑے کر دیے۔ پاکستان کے پاس شروع شروع میں وسائل کی بہت کمی تھی، یہاں تک کہ روزمرہ کے عام سرکاری کام چلانے میں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انتہائی محدود وسائل کے باوجود قوم میں جذبۂ تعمیر کی کمی نہ تھی۔ پاکستانی قوم احساس محرومی و کمتری کا شکار نہیں ہوئی بلکہ وہ قومی جذبے سے سرشار تعمیر وطن کے لیے تیار ہو گئی۔ کیوں نہ ہوتی! ان کے قائد کی مثال اور اس کی رہنمائی ان کی ہمسفر تھی۔

کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ مرکزی حکومت کے کئی دفاتر مناسب سرکاری عمارات نہ ہونے کی وجہ سے بارکوں میں قائم کیے گئے۔ بعض ریل گاڑیوں پر جن میں پاکستان کے حصے کا ضروری دفتری ریکارڈ اور سرکاری ملازم دہلی سے پاکستان آ رہے تھے، سفر کے دوران میں ان پر ہندوؤں کی جانب سے حملے ہوئے جس سے بیش قیمت سرکاری ریکارڈ اور ان گنت قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ ایسے دل گداز حالات میں بھی پاکستانی عوام اور سرکاری ملازمین مایوس نہ ہوئے بلکہ زیادہ تندہی سے ملکی کاموں میں حصہ لینے لگے۔

مہاجرین کا مسئلہ : تقسیم برصغیر ہند کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے ایک

باقاعدہ اسکیم کے تحت پورے بھارت میں بالعموم اور مشرقی پنجاب میں بالخصوص مسلمانوں کے استحصال کی مہم شروع کی، جس کے نتیجے میں انسانیت دشمن ہندوؤں اور سکھوں نے ہزاروں بلکہ لاکھوں عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کو انتہائی بے دردی و سنگدلی سے قتل کیا اور بے آبرو کیا۔ روزانہ لاکھوں تباہ حال، فاقہ زدہ زخمی مہاجرین بھارت سے پاکستان پہنچ رہے تھے۔ مسلمان مہاجرین کے ان قافلوں کے لیے قیام، خوراک، طبی امداد، تعلیم، روزگار اور مستقل آبادکاری کا انتظام ضروری تھا لیکن اس کے لیے بے پناہ وسائل کی ضرورت تھی، جن سے نوزائیدہ مملکت محروم تھی۔ مہاجرین کے عارضی قیام کے لیے جو کیمپ لگائے گئے، وہ بھی بہت ناکافی ثابت ہوئے۔ نتیجتاً مہاجرین نے مجبوراً سڑکوں کے کنارے، درختوں کے نیچے اور فٹ پاتھوں پر پناہ لی۔ پاکستان کی انتظامیہ کے لیے مہاجرین کا مسئلہ ایک چیلنج سے کم نہ تھا مگر حکومت اور عوام نے مل کر اسے حل کیا۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں کبھی بھی کسی قوم کے لوگوں کا کسی ملک سے اخراج نہیں ہوا، جتنی تعداد میں بھارت سے مسلم مہاجرین پاکستان میں آکر آباد ہوئے۔ ایک اندازے کے مطابق 1948ء تک سوا کروڑ مہاجرین پاکستان میں داخل ہوئے اور ان کی تعداد بتدریج بڑھتی رہی۔

پاکستان میں آنے کے بعد اگر مہاجرین حوصلہ ہار دیتے اور مایوسی کا شکار ہو جاتے یا اہل پاکستان خود غرضی کا مظاہرہ کرتے یا حکومت پاکستان کے عزم میں کوئی فرق آجاتا تو مملکت پاکستان کے لیے مزید مشکلات کے دروازے کھل سکتے تھے، مگر ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ پاکستان کے عوام اور نو وارد مہاجرین قائداعظم کی رہنمائی اور قیادت میں نیا عزم لیے ہوئے تھے۔

اثاثوں کی تقسیم: تقسیم ہند کے وقت طے پایا تھا کہ برطانوی ہند کے اثاثوں کی تقسیم بھی پاکستان اور بھارت کے مابین ہوگی، مگر کانگرس اور ہندو لیڈروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بہت ہی کم سامان پاکستان پہنچایا گیا۔

متحدہ ہندوستان کا 4 ارب روپے کا محفوظ سرمایہ تھا۔ معاہدے کے مطابق اس میں سے ایک چوتھائی یعنی ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصے میں آنا تھا لیکن بھارت نے صرف بیس کروڑ روپے دیے اور مزید رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس متحدہ ہندوستان کے قرضہ جات کا 20 فی صد پاکستان کے ذمے ڈال دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ اثاثہ جات کی رقوم کو روک کر کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ نومبر 1947ء میں اس سلسلے میں پاکستان اور بھارت کے نمائندوں کے مابین دہلی میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ قومی قرضوں میں پاکستان کا حصہ $17\frac{1}{2}$ فی صد ہوگا۔ دسمبر 1947ء میں دونوں حکومتوں نے اس معاہدے کی توثیق کر دی مگر اس کے باوجود بھی ہندوستان کی حکومت نے بقایا رقم دینے سے انکار کر دیا۔

افواج اور فوجی اثاثوں کی تقسیم: تقسیم ہند کے وقت افواج اور فوجی اثاثوں کی تقسیم کا مسئلہ بڑا حسّاس اور نازک مسئلہ تھا۔ انگریز کمانڈر انچیف افواج کی تقسیم کے خلاف تھا مگر قائداعظم کی دلیل یہ تھی کہ ایک ملک کی اپنی خود مختار فوج ہونی چاہیے کیونکہ فوج کا کام نہ صرف ملکی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہوتا ہے بلکہ اسے ملک کی تعمیر میں بھی حصہ لینا ہوتا ہے۔ تقسیم افواج کے لیے ایک سات رکنی کمیٹی بنائی گئی جس کا سربراہ کمانڈر انچیف تھا۔ یہ طے پایا کہ افواج کی تقسیم کا کام یکم اپریل 1948ء تک مکمل ہو جانا چاہیے۔

افواج کی تقسیم کے ساتھ ہی یہ طے پایا تھا کہ متحدہ ہندوستان کے فوجی ساز و سامان کا ایک تہائی حکومت پاکستان کو ملے گا۔ تقسیم ہند کے وقت اسلحہ بنانے والی قریباً تمام فیکٹریاں ہندوستانی علاقے میں تھیں۔ نیز فوجی ذخائر کے ڈپو بھی ان علاقوں میں تھے، جو بھارت میں شامل ہوئے۔ ایک سازش کے تحت بھارتی حکومت نے اسلحہ ساز فیکٹریوں کو پاکستان منتقل کرنے سے انکار کر دیا اور ڈپوؤں میں موجود اسلحے کو پاکستان بھیجنے کے کام کو التوا میں

ڈال دیا تا کہ جہاں تک ممکن ہو پاکستان کو اس کے جائز فوجی اثاثوں سے بھی محروم کر دیا جائے۔

بھارت نے افواج کے بھیجنے اور فوجی اثاثوں کی تقسیم پر ایسے ایسے روڑے اٹکائے کہ انگریز کمانڈر انچیف نے نہرو حکومت کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر استعفیٰ دے دیا۔ اس سے افواج کی تقسیم کے کام میں پاکستان کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کمانڈر انچیف نے برطانوی حکومت کو اپنی ایک خفیہ رپورٹ میں لکھا کہ نہرو حکومت یہ مصمم ارادہ کر چکی ہے کہ جہاں تک ہو سکے، وہ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم ہونے سے دور رکھے گی۔

نہری پانی کا مسئلہ: پنجاب کی غیر منصفانہ اور غلط طریقے سے تقسیم کے نتیجے میں نہری پانی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ریڈکلف نے حد بندی کے فیصلے میں دریائے راوی پر مادھو پور کا ہیڈ ورکس اور دریائے ستلج پر فیروز پور کا ہیڈ ورکس بھارت کو دے دیے، جب کہ یہاں سے نکلنے والی نہریں پاکستان میں واقع ہیں اور وسیع پاکستانی علاقے کے لیے آبپاشی کا ذریعہ ہیں۔ یکم اپریل 1948ء کو بھارت نے ان ہیڈ ورکس سے پاکستانی نہروں کا پانی بغیر پیشگی اطلاع دیے بند کر دیا۔ اس فعل سے بھارت کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان نہروں سے سیراب ہونے والی پنجاب کی زرعی زمین بے آب و گیاہ صحراؤں میں تبدیل ہو جائے اور پاکستان کی معیشت کو نقصان پہنچے۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی حکومت نے مشرقی دریاؤں یعنی راوی، بیاس اور ستلج پر ملکیت کا دعویٰ کیا۔ بھارت کا یہ دعویٰ بین الاقوامی قانون کے خلاف تھا چنانچہ پاکستان نے اقوام متحدہ سے رجوع کیا۔ عالمی بینک نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ طویل مذاکرات کے بعد 1960ء میں سندھ طاس کا معاہدہ طے پایا جس کی توثیق دونوں حکومتوں نے 1961ء میں کر دی۔ اس معاہدے کے مطابق یہ طے پایا کہ تین مشرقی دریاؤں (ستلج، بیاس، راوی) کے

استعمال کا حق بھارت کو حاصل ہوگا اور تین مغربی دریا (چناب، جہلم اور سندھ) پاکستان کے حوالے کر دیے گئے۔ اس معاہدے پر عمل درآمد کے بعد نہری پانی کا مسئلہ اب بہت حد تک حل ہو گیا ہے۔

ریاستوں کے الحاق کے مسائل: قانون آزادی ہند 1947ء میں حکومت برطانیہ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ تقسیم ہند کے بعد برطانوی اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ ہو جائے گا لہٰذا 1946ء کے کیبنٹ مشن پلان کے مطابق والیان ریاست کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی جغرافیائی حیثیت اور رعایا کی خواہشات کے مطابق پاکستان یا بھارت جس کے ساتھ وہ چاہیں، شامل ہو سکتے ہیں چنانچہ بہاولپور، لس بیلہ، مکران، قلات اور صوبہ سرحد کی ریاستیں پاکستان میں شامل ہو گئیں ان کے علاوہ جونا گڑھ، مناوادر اور منگرول نے بھی پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کیا مگر بھارت نے زبردستی ان پر قبضہ کر لیا۔ تقسیم ہند کے وقت ان تینوں ریاستوں کے مسلم حکمرانوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا، کیونکہ سمندر کے راستے ان ریاستوں کا پاکستان سے آزادانہ رابطہ قائم ہو سکتا تھا۔ بھارتی حکومت نے ان کے الحاق پر حکومت پاکستان سے احتجاج کیا مگر قائداعظم نے کہا کہ یہ ریاستیں پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد اب پاکستان کا حصہ بن چکی ہیں۔ ان ریاستوں پر بھارت کی طرف سے دباؤ ڈالنے کا مطلب پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت ہوگا۔ قائداعظم کی قیادت میں بھارت کو ان ریاستوں پر غاصبانہ قبضہ کی جرأت نہ ہوئی، لیکن ان کی وفات کے بعد نومبر 1948ء میں بیس ہزار ہندوستانی فوج جونا گڑھ میں داخل ہو گئی اور ریاست پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ جونا گڑھ کے حکمران نے بھاگ کر کراچی میں پناہ لی۔ بھارت نے یہ کہہ کر اس ریاست پر قبضہ کر لیا کہ وہاں کے عوام بھارت سے الحاق چاہتے تھے، لیکن یہی اصول بھارت نے مشرقی پنجاب کی ریاست نابھا اور کشمیر میں تسلیم نہیں کیے۔ نابھا کی 64 فی صد آبادی مسلم تھی اور جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کی سرحد کے ساتھ ملی ہوئی تھی نیز وہاں کے مسلم عوام بھی پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے تھے، لیکن بھارتی حکومت نے نابھا

کے راجا کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے باز رکھا۔

ریاست جموں و کشمیر برصغیر کی تمام شاہی ریاستوں میں سے ایک نہایت ہی اہم ریاست تھی جس کی قریباً ایک ہزار کلومیٹر لمبی سرحد پاکستان کے ساتھ ملتی ہے۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی چالیس لاکھ تھی۔ کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی 96 فی صد اور جموں میں مسلمانوں کی آبادی 70 فی صد تھی۔ نسل، تمدن، خوراک، رسم و رواج اور لباس کے اعتبار سے ریاست کشمیر کے مسلمان، پاکستان کے مسلمانوں کے بہت قریب ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیر کے سب دریا بہہ کر پاکستان میں آتے ہیں۔ ریاست کے تینوں راستے (1) سرینگر جموں، سیالکوٹ (2) سرینگر۔ ایبٹ آباد اور (3) سرینگر۔ راولپنڈی، پاکستان آتے ہیں۔ ان کے علاوہ 1947ء میں ریاست جموں و کشمیر کا بیرونی دنیا سے بذریعہ سڑک کوئی راستہ نہ تھا مگر کانگرس، ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کے گٹھ جوڑ نے انتہائی دھاندلی سے کام لیتے ہوئے، گورداسپور کا علاقہ بھارت میں شامل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کو براستہ کٹھوعہ جموں تک راستہ مہیا کر دیا گیا جس سے کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضے کی سازش اور انتظامات مکمل ہو گئے۔ اندریں حالات وہاں کے راجا نے بھارت کے ساتھ الحاق کی تیاریاں شروع کر دیں۔

مہاراجہ نے ریاست کی فوج اور پولیس میں سے تمام مسلمان ملازمین کو برخاست کرکے ان سے ہتھیار رکھوا لیے۔ حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے خلاف پونچھ کے مسلم مجاہدین نے اپنی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھائے۔ مظلوم مسلمانوں کو مہاراجہ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ وہ کیمپوں میں جمع ہو جائیں تاکہ انہیں بحفاظت سیالکوٹ پہنچا دیا جائے۔ اس طرح دھوکا دے کر نہتے مسلمانوں کو کیمپوں میں جمع کرکے ان کا قتل عام کیا گیا۔ اس قتل عام کی خبر سن کر بہت سے قبائلی اور پاکستان سے بہت سے رضا کار اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے ریاست میں داخل ہوئے اور تیزی سے سری نگر کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ 24 اکتوبر

1947ء کو آزاد کشمیر حکومت کا اعلان کیا گیا ۔ مہاراجہ بھاگ کر جموں پہنچا اور طے شدہ سازش کے تحت بھارت سے فوجی امداد طلب کی ۔ مہاراجہ کی بھارت میں زبانی شمولیت پر بھارتی حکومت نے ریاست جموں و کشمیر میں اپنی باقاعدہ فضائیہ اور بری افواج بڑی تعداد میں داخل کر دیں ۔

قیام پاکستان کے وقت مہاراجہ نے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے تک پاکستان کے ساتھ ایک معاہدہ جاریہ یعنی حالات جوں کے توں رکھنے کا معاہدہ (Agreement of Status Quo) کیا تھا لہٰذا قائداعظم نے اعلان کیا کہ اس نام نہاد الحاق کو درج ذیل وجوہات کی بناء پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا :

1۔ بھارت کے ساتھ ریاست جموں و کشمیر کا نام نہاد الحاق عوام کی خواہشات کے منافی ہے ۔

2۔ معاہدہ جاریہ کی موجودگی میں مہاراجہ یک طرفہ طور پر حالات کی تبدیلی کا مجاز نہیں ۔

3۔ جس وقت مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کی پیش کش کی ، اس وقت ریاست کے ایک بڑے حصے پر اس کا اقتدار ختم ہو چکا تھا ۔

اس موقعہ پر پاکستان نے براہ راست بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ۔ یکم نومبر 1947ء کو قائداعظم نے اس سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن سے گفت و شنید کی لیکن پنڈت نہرو نے مخالفت کی ۔

جب بھارتی فوج قوت سے ریاست پر قبضہ کرنے میں ناکام رہی تو یکم جنوری 1948ء کو بھارتی حکومت نے مسئلہ کشمیر، سلامتی کونسل میں پیش کیا اور کہا کہ ریاست میں امن و امان بحال ہونے پر وہ کشمیری عوام کی خواہشات معلوم کرنے کے لیے غیر جانبدارانہ طور پر رائے شماری کروائے گا ۔

کشمیر کے مسئلے کے حل کی غرض سے سلامتی کونسل نے 12 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کو دو قراردادیں منظور کیں جن کو پاکستان اور بھارت کی حکومتوں نے بھی تسلیم کیا ۔ ان کا لب لباب یہ ہے :

1۔ جنگ فوری طور پر بند کرا دی جائے اور اقوام متحدہ کے کمیشن کی نگرانی میں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے درمیان جنگ بندی لائن کھینچ دی جائے۔

2۔ دونوں حکومتیں کشمیر سے اپنی اپنی فوجیں ہٹا لیں۔

3۔ اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب رائے کا انتظام کیا جائے۔

سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق جنگ بندی تو ہو گئی لیکن ریاست میں استصواب رائے کی نوبت آج تک نہ آ سکی۔ آج تک کشمیر کا مسئلہ دونوں مملکتوں کی راہ میں کشیدگی کا سبب بنا ہوا ہے۔ 1949ء سے 1953ء کے عرصہ میں اقوام متحدہ کی طرف سے کئی ناظم رائے شماری مقرر ہو کر آئے۔ پاکستان نے ان کے ساتھ مکمل تعاون کیا لیکن بھارت نے کسی نہ کسی حیلے ان کی تجاویز کو رد کر دیا۔ 1957ء میں سلامتی کونسل کی کوشش ایک بار پھر بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ 1962ء میں راولپنڈی اور 1963ء میں دہلی میں دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ نے اس مسئلے پر مذاکرات کیے۔ 1964ء میں بھی کوشش کی گئی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

مسئلہ کشمیر کی وجہ سے دونوں ممالک کی ایک دوسرے کے ساتھ کئی جنگیں بھی ہو چکی ہیں، مگر بدقسمتی سے بھارت کی روایتی سامراجیت کی وجہ سے آج تک یہ مسئلہ دونوں ممالک کے مابین کشیدگی کا باعث ہے۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ نہ صرف پاکستان کی ابتدائی مشکلات اور مسائل بھارت کے پیدا کردہ ہیں بلکہ پاکستان کا ہر مسئلہ بھارت کا پیدا کردہ ہے جبکہ پاکستان نے شروع ہی سے بھارت کے ساتھ اچھے ہمسائیوں جیسے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

قائداعظم اور استحکام پاکستان

تحریک قیام پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کا کردار اور ان کی

قائدانہ صلاحیتیں اظہر من الشمس ہیں۔ اس تحریک میں قائداعظم کی شخصیت اور ان کی بصیرت ہی نے اتنے مشکل اور کٹھن کام کو آسان بنا دیا اور پاکستان کی عظیم اسلامی مملکت روئے ارض پر نمودار ہوئی۔

جہاں قیامِ پاکستان کے لیے بے شمار قربانیوں اور مسلسل جد و جہد کی ضرورت تھی، اس کے قائم رکھنے اور مضبوط بنانے میں بھی سخت محنت اور لگن درکار تھی۔ قائداعظم کی عظیم قیادت نے اس کام کو بہت حد تک آسان بنا دیا۔ انھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد ایک قومی جذبہ بیدار کر دیا جس کے سامنے دنیا کی کوئی بھی مشکل ہیچ تھی۔ قائداعظم نے کوشش کی کہ ابتدا میں تمام مسائل کا اصولی طور پر حل تلاش کر کے ایسا لائحہ عمل بنا لیا جائے جس پر چل کر ملکی ترقی کی راہوں کی نشاندہی آسانی سے ہو سکے، مگر قدرت نے قیامِ پاکستان کے بعد بہت ہی قلیل عرصے کے لیے ہمارے اس عظیم قائد کی سرپرستی ہمیں عنایت کی۔ قائداعظم کے دور میں جو اہم امور طے ہوئے، ان کا اجمالی جائزہ یوں ہے :

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس کراچی میں 11 اگست 1947ء کو ہوا۔ یہ دستور ساز اسمبلی ان ممبران پر مشتمل تھی جو ان علاقوں سے منتخب ہوئے تھے جو اس وقت پاکستان میں شامل ہوئے۔ 14 اگست 1947ء کو قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ لیاقت علی خاں کو ملک کا پہلا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اگرچہ 1935ء کے ایکٹ کے ترمیم شدہ قانون کے مطابق گورنر جنرل کے اختیارات محدود تھے مگر قائداعظم کی عوام میں بے پناہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی بدولت ان کو خود بخود وسیع اختیارات حاصل ہو گئے تھے، چنانچہ کئی دفعہ انھوں نے کابینہ کے اجلاس کی صدارت کی۔ جن اہم امور کی طرف قائداعظم نے فوری و خصوصی توجہ دی اور رہنما اصول بیان کر کے قوم کی رہنمائی کی، ان کا جائزہ درج ذیل ہے۔ قوم نے آپ کی آواز پر لبیک کہا جس کی بدولت نوزائیدہ مملکت نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیں۔

1۔ مہاجرین کی آباد کاری ۔

2۔ سرکاری افسران کو رویہ تبدیل کرنے کی تلقین ۔

3۔ صوبائی اور نسلی تعصب سے گریز کرنے کی تلقین ۔

4۔ پاکستان کی معیشت کے رہنما اصولوں کا تعین ۔

5۔ خارجہ حکمت عملی ۔

6۔ طلبہ کو حصول علم کی طرف توجہ دلانا ۔

1۔ مہاجرین کی آباد کاری : قیام پاکستان کے وقت جو مسائل درپیش تھے ، ان میں یہ وہ اہم مسئلہ تھا جس کی طرف قائداعظم نے سب سے زیادہ توجہ دی ۔ قائداعظم ریلیف فنڈ قائم کیا گیا ۔ عوام اور صاحب ثروت لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے مسلمان مہاجر بھائیوں کی زیادہ سے زیادہ مالی امداد کریں ۔ اکتوبر 1947ء میں آپ کچھ عرصہ کے لیے لاہور تشریف لے گئے تا کہ وہاں مہاجرین کے آنے والے زبردست سیلاب سے پیدا ہونے والے مسائل کا قریب سے جائزہ لے سکیں اور ان لٹے پٹے بے سہارا افراد کی رہائش اور خوراک کا بندوبست کر سکیں ۔ 30 اکتوبر 1947ء کو لاہور ہی میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا : "اب یہ ہم پاکستانیوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لاکھوں تباہ حال مہاجرین جو اپنا سب کچھ بھارت میں چھوڑ کر پاکستان آ رہے ہیں ، ان کی ہر ممکن امداد کی جائے ، انھیں یہ مصیبتیں اس لیے سہنا پڑیں کہ وہ مسلمان ہیں ۔"

آپ نے شہریوں سے بھی اپیل کی کہ وہ نہایت صبر سے کام لیں اور ہر لحاظ سے اپنے مہاجر بھائیوں کی آباد کاری میں حکومت کی مدد کریں ۔ آپ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پاکستان کے عوام نے بھرپور حصہ لیا ۔ ریلیف فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا اور ہر سطح پر مہاجرین کی امداد کی ۔

2۔ سرکاری افسران کو رویہ تبدیل کرنے کی تلقین : قائداعظم نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا کہ قیام پاکستان کے بعد اب سرکاری افسران کا کردار

حاکم کا سا نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ عوام کے خادم بن کر رہیں۔ 25 مارچ 1948ء کو سرکاری افسران سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا "آپ (سرکاری افسران) کو قوم کے خادم کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دینے چاہییں۔ آپ کو کسی سیاسی جماعت سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ کوئی بھی سیاسی جماعت برسراقتدار آ سکتی ہے، مگر آپ کا رویہ عوام سے ایسا ہونا چاہیے کہ ان کو احساس ہو کہ آپ حکمران نہیں، آپ قوم کے خادم ہیں۔ آپ انصاف، ایمانداری اور ثابت قدمی سے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اگر آپ میری نصیحت پر عمل پیرا ہوں گے تو مجھے یقین ہے کہ عوام کی نگاہ میں آپ کا مقام اور مرتبہ بلند ہوگا"۔

قائداعظم کے فرمان کا جملہ افسران اور اہل کاروں پر خاطر خواہ اثر ہوا اور انہوں نے نہایت محنت سے، رات دن ایک کر کے ابتدائی بحران سے پاکستان کو نکالا۔

3۔ صوبائی اور نسلی تعصب سے گریز کرنے کی تلقین: صوبائی اور نسلی خطرے کو بھانپتے ہوئے قائداعظم نے قوم کو بروقت اس کی طرف متوجہ کروایا۔ آپ نے 15 جون 1948ء کو فرمایا

"اب ہم پاکستانی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی بلوچی، پٹھان، سندھی، بنگالی اور پنجابی نہیں بلکہ سب پاکستانی ہیں۔ ہماری سوچ اور ہمارا عمل پاکستانی کی حیثیت سے ہونا چاہیے اور ہمیں پاکستانی ہونے پر فخر کرنا چاہیے۔"

آپ نے مختلف صوبوں کا دورہ کیا۔ ان کے مسائل پر توجہ دی۔ ان صوبوں کے عوام کو نئی امید دی اور پاکستان سے وابستگی کے جذبات کو تیز کر کے انہیں نئی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں وزیرستان ایجنسی سے فوجیں ہٹا دیں۔ اس طرح اس علاقے کے لوگوں کو یہ احساس دلایا گیا کہ یہ بھی پاکستان کا اٹوٹ انگ ہیں۔ انہوں نے ریاستوں اور سرحدی علاقوں کی ایک نئی وزارت قائم کی۔ کراچی کو ملک کا دارالخلافہ بنا دیا

ریاستوں کی پاکستان میں شمولیت کو یقینی بنایا ۔ اس میں خاص طور سے مسئلہ ریاست قلات کا تھا ۔

4- پاکستان کی معیشت کے رہنما اصولوں کا تعین : معیشت اور اقتصادیات جیسا اہم مسئلہ بھلا قائداعظم کی نظروں سے کیسے اوجھل رہ سکتا تھا ۔ پاکستان کے مستقبل کے مجوزہ نظام سے متعلق آپ نے اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر یکم جولائی 1948ء کو فرمایا ، ''مغربی معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاتعداد ناقابل حل مسائل کھڑے کر دیے ہیں ۔ مغربی طرز کا معاشی نظام ہمارے ملک میں خوش حالی اور ترقی نہیں پیدا کر سکتا ، اس لیے ہمیں اپنی بہبود کے لیے کوئی نیا طریقہ وضع کرنا ہوگا اور دنیا کو ایسا معاشی نظام پیش کرنا ہوگا ، جس کی بنیادیں اسلامی مساوات اور معاشرتی انصاف پر مبنی ہوں ۔ ایسا کرنے سے ہم مسلمان قوم کی حیثیت سے دنیا کو ایک ایسا معاشی نظام دینے میں کامیاب ہو جائیں گے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے امن کا پیغام بن کر آئے گا ۔ یاد رہے کہ امن ہی سے انسانیت کی بقا اور خوش حالی قائم رہ سکتی ہے ۔''

اس کے ساتھ ساتھ فوری مسئلہ لاکھوں مہاجرین کی آباد کاری کا تھا ۔ دوسری طرف بھارت نے تقسیم کے اصول کے مطابق پاکستان کے حصے میں آنے والے سرمایہ میں سے ایک کثیر رقم پاکستان کو ادا نہ کی تھی ۔ اس طرح اس نئے ملک کو ابتدا ہی میں شدید مالی بحران سے دو چار ہونا پڑا ۔ قائداعظم نے اس مسئلے کو بڑی سنجیدگی سے لیا ۔ انھوں نے مہاجرین کے لیے ایک ریلیف فنڈ قائم کیا جس سے صورت حال کسی حد تک سنبھل گئی ۔

5- خارجہ حکمت عملی : قیامِ پاکستان کے فوراً بعد قائداعظم نے پاکستان کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کی طرف توجہ دی ۔ قائداعظم کی ہدایات کے مطابق قیامِ پاکستان سے چند مہینوں کے اندر بہت سے ممالک کے ساتھ پاکستان کے سفارتی تعلقات قائم ہوئے ۔ آپ کی خارجہ پالیسی میں مسلمان

ممالک کے مابین اتحاد کا عنصر غالب رہا۔ آپ کی خارجہ پالیسی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ تمام ممالک سے بالعموم اور ہمسایہ و مسلم ممالک سے بالخصوص برابری کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔

ابتدا ہی میں پاکستان کو خارجی معاملات میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام مسائل کا محرک بھارت تھا۔ مسائل کی مختصراً تفصیل یہ ہے۔

نومبر 1947ء میں ریاست جونا گڑھ پر جس نے بنیادی طور پر پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا، بھارت نے فوج کشی کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔

کشمیر کے مسلمانوں پر بھارت نے مظالم ڈھانا شروع کر دیے اور ساتھ ہی پاکستانی سرحد کے ساتھ اپنی افواج ڈال دیں۔ نتیجے کے طور پر ایک جنگ بھی پاکستان پر تھوپ دی گئی جس کا مجموعی حالات میں پاکستان متحمل نہ ہو سکتا تھا، مگر ہمارے جری و بہادر جوانوں نے اپنی جواں ہمتی سے دشمن کو شکست دی۔

مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے آپ نے بھارتی حکومت سے مذاکرات شروع کیے اور برطانوی حکومت کے دفتر دولت مشترکہ سے مسلسل مراسلت بھی کرتے رہے۔ اس کا مقصد دولت مشترکہ کے دفتر کو مجبور کرنا تھا کہ وہ دونوں مملکتوں میں پائی جانے والی کشیدگی کو کم کرنے اور اس علاقے میں امن و استحکام قائم کرنے کی کوئی تدبیر کرے۔

6۔ **طلبہ کو حصول تعلیم کی طرف توجہ دلانا:** کسی بھی معاشرے میں نوجوانوں کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے، قائداعظم اس سے بخوبی آشنا تھے۔ نوجوان ہی کسی ملک کا مستقبل ہے۔ اسی بات کے پیش نظر پشاور میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے نوجوانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنی تمام تر توجہ حصول علم پر مرکوز کریں۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں طلبہ نے جو اہم کردار ادا کیا، قائداعظم نے اس کی تعریف کی مگر فرمایا کہ طلبہ کو اب احتجاجی سیاست سے کلیتاً گریز کرنا ہوگا۔ اس میں پاکستان کی بقا اور

خوش حالی ہے۔

قائداعظم نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور تدبر کی بدولت مسلمانان برصغیر کے لیے نہ صرف ایک علیٰحدہ مسلم ریاست حاصل کی بلکہ اس کو مستحکم کرنے کے لیے کام بھی کیا اور رہنما اصول بھی بیان کیے۔ اب ہم پر لازم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک مملکت خداداد پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے اپنا بھرپور، مثبت اور فعال کردار ادا کرے تا کہ جو خواب مسلمانانِ جنوبی ایشیا نے قائداعظم کی والہانہ قیادت میں دیکھا تھا، صحیح معنوں میں شرمندہ تعبیر ہو اور یہ قطعۂ زمین حقیقی معنوں میں اسلام کا قطعہ اور اس کی سر زمین ثابت ہو۔

سوالات

(الف) 1۔ 1940ء سے قیامِ پاکستان تک کے برصغیر کے سیاسی حالات کا مختصر جائزہ لیں۔

2۔ پاکستان کے قیام کے بعد ابتدائی مسائل اور ان میں پاکستانی عوام کے کردار کا جائزہ لیں۔

3۔ قائداعظم محمد علی جناح نے استحکام پاکستان کے لیے کیسے رہنمائی کی؟

(ب) درست کے آگے ✓ کا نشان لگائیں:

1۔ پہلی جنگ عظیم نے انگریزوں کے عالمی اقتدار کو کمزور کر دیا تھا۔

2۔ 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں ـــــ کے اجلاس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔

(آل انڈیا مسلم لیگ، یونینسٹ پارٹی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)۔

3۔ برطانوی کابینہ کا وزیر سر اسٹیفورڈ کرپس ـــــ میں ہندوستان آیا۔

(6 جون 1940ء، مارچ 1942ء، 4 جون 1947ء)

4۔ 1945-46ء کے موسم سرما میں ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی ۔

5۔ ــــ کو ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا گیا ۔
(6 جون 1940ء ، 3 جون 1947ء ، 14 اگست 1947ء)

6۔ 18 جولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے منصوبہ تقسیم ہند کو منظور کرکے اسے قانون بنا دیا ۔

7۔ تقسیم ہند کے وقت پنجاب کی حد بندی میں گورداسپور ، بٹالہ ، فیروز پور کی تحصیلوں کو ناجائز طور پر بھارت میں شامل کر دیا گیا ۔

8۔ اثاثوں کی تقسیم سے متعلق پاکستان اور بھارت کے نمائندوں کے مابین ــــ میں کانفرنس ہوئی ۔ (لاہور ، دہلی ، بمبئی)

9۔ ــــ نے ریاست جموں و کشمیر کی پولیس اور فوج میں سے تمام مسلمان ملازمین کو برخاست کرکے ان سے ہتھیار رکھوا لیے ۔
(مہاراجہ کشمیر ، بھارتی حکومت ، انگریز وائسرائے)

10۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور تدبر کی بدولت مسلمانان برصغیر کے لیے نہ صرف ایک علیحدہ مسلم ریاست حاصل کی بلکہ اس کے استحکام کے لیے بنیادی اصول سمجھائے ۔

(ج) مختصر جواب لکھیں :

(i) مسلمانان برصغیر کی ایک سیاسی ، مذہبی اور ثقافتی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے جن مسلمان زعما نے خاص طور سے خدمات سرانجام دیں، ان میں سے صرف پانچ کے نام لکھیں ۔

(ii) ہندوستان میں مغربی جمہوریت کے نفاذ کا مطلب مسلمانوں کے لیے کیا ہو سکتا تھا ۔

(iii) کیبنٹ مشن کب ہندوستان آیا ؟

(iv) تقسیم برصغیر کے وقت برطانیہ میں کون سی پارٹی برسراقتدار تھی ؟

(v) تقسیم برصغیر کے منصوبہ کے تین اہم نکات لکھیں۔

(vi) قانون آزادی ہند 1947ء کی تین اہم دفعات لکھیں۔

(vii) ریڈکلف ایوارڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے کیا فرمایا؟

(viii) سندھ طاس کا منصوبہ کیا تھا؟

(ix) 1941ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب کیا تھا؟



اسلامی ریاست کا قیام

قیام پاکستان (14 اگست 1947ء) کے بعد کاروبار ریاست چلانے کے لیے حکومت ہند کے قانون مجریہ 1935ء (جس کے متعلق آپ پہلی جماعتوں میں پڑھ چکے ہیں) کو ضروری ترامیم کے ساتھ عبوری آئین کے طور پر نافذ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کے لیے مستقل آئین بنانے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں پہلا اہم قدم قرارداد مقاصد کی تیاری تھا جسے مارچ 1949ء میں دستور ساز اسمبلی نے منظور کیا۔ یہ دستور ساز اسمبلی ان ممبران پر مشتمل تھی جو 1945-46ء کے انتخابات کے نتیجے میں ان علاقوں سے منتخب ہوئے تھے جو بعد میں پاکستان میں شامل ہوئے۔

قرارداد مقاصد

پاکستان کی آئین سازی کی تاریخ میں قرارداد مقاصد ایک بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں اسلام کو پاکستان کے آئین کی نظریاتی اساس قرار دیا گیا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جد و جہد آزادی کے دوران میں مسلمانان برصغیر کا مطالبہ تھا کہ انہیں ایک ایسا وطن چاہیے جس میں وہ اپنی زندگیاں اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق گزار سکیں اور اپنے تہذیبی اور تمدنی ورثے کی خاطر خواہ حفاظت کا بندوبست کر سکیں۔ لہٰذا پاکستان کے

وجود میں آنے کے بعد یہ فطرتی امر تھا کہ ہم اسلام کو حکومت اور سیاست کی بنیاد قرار دیتے۔

قرارداد مقاصد کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں :

(i) اللہ تعالیٰ بلا شرکتِ غیرے اس کائنات پر اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے۔ پاکستان کے عوام اختیارات کو خدا کی مقرر کردہ حدود میں رہ کر بطور ایک مقدس امانت استعمال کریں گے۔

(ii) جمہوریت ، مساوات اور معاشرتی عدل کے وہ تصورات جو اسلام نے پیش کیے ہیں ، ملک میں نافذ کیے جائیں گے۔

(iii) پاکستان میں مسلمانوں کو ایسے مواقع فراہم کیے جائیں گے کہ وہ اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں۔

(iv) غیر مسلم اقلیتوں کو اپنے مذاہب اور عقائد پر عمل پیرا ہونے اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دینے کی آزادی ہوگی۔ ان اقلیتوں اور دوسرے پسماندہ طبقوں کے جائز حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا جائے گا۔

(v) ملک میں وفاقی نظام حکومت قائم کیا جائے گا جس میں صوبوں کو مقرر کردہ آئینی حدود کے اندر رہتے ہوئے خود مختاری حاصل ہوگی۔

(vi) بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔

(vii) آزاد عدلیہ قائم کی جائے گی۔

قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد دستور ساز اسمبلی نے آئین سازی کی طرف توجہ دی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دستور ساز اسمبلی نے کئی کمیٹیاں تشکیل دیں ، جن میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور اس کی ذیلی کمیٹیاں سب سے اہم ہیں۔ ان کمیٹیوں نے آئین سے متعلق امور کا مطالعہ کرنے کے بعد 1950ء میں دستور ساز اسمبلی کو رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں وفاقی ، پارلیمانی نظام اور دو ایوانی مقننہ کے علاوہ آزاد عدلیہ اور بنیادی حقوق کی ضمانت

کی سفارش کی گئی۔ دستور ساز اسمبلی نے ان تجاویز کا بغور جائزہ لینے کے بعد ان میں کچھ ترامیم پیش کیں۔ ان ترامیم پر بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے غور کیا اور اپنی ترامیم شدہ رپورٹ 1952ء میں دستور ساز اسمبلی کو پیش کر دی۔ ابھی اس رپورٹ پر گفت و شنید جاری تھی کہ محمد علی بوگرا وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انھوں نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹوں اور دستور ساز اسمبلی میں ہونے والی بحث کو سامنے رکھتے ہوئے ایک آئینی خاکہ تیار کروایا جو کہ محمد علی فارمولا کے نام سے مشہور ہوا۔ اس فارمولے میں وفاقی پارلیمانی نظام، دو ایوانی مقننہ، آزاد عدلیہ، بنیادی حقوق اور (سابق) مشرقی اور مغربی پاکستان کی مقننہ میں نمائندگی کے لیے برابری (Parity) کے اصول کی سفارش کی گئی۔ امید تھی کہ محمد علی فارمولے کی بنیاد پر ملک کا آئین جلد بن سکے گا لیکن 1954ء میں گورنر جنرل نے دستور ساز اسمبلی کو برخاست کر دیا۔ 1955ء میں نئی دستور ساز اسمبلی منتخب ہوئی۔ آئین سازی کا کام دوبارہ شروع ہوا اور ایک سال سے کم عرصہ میں نیا آئین منظور کر لیا گیا جو 23 مارچ 1956ء کو نافذ ہوا، اسی لیے اسے 1956ء کے آئین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ آئین 234 دفعات اور چھ ضمیموں پر مشتمل تھا۔ اس آئین میں اسلام کو پاکستان کے تشخص اور سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا گیا۔

1956ء کے آئین کی اسلامی دفعات

1949ء کی قرارداد مقاصد کو 1956ء کے آئین میں افتتاحیہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالٰی کی حاکمیت کے اصول کو قبول کیا گیا اور پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ تمام اختیارات کو قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مقرر کردہ حدود میں رہ کر بطور امانت استعمال میں لایا جائے گا۔

آئین میں واضح طور پر کہا گیا کہ مسلمانوں کو اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنے کے لیے پوری سہولتیں مہیا کی جائیں گی اور حکومت

پاکستان ، اسلامی ممالک سے قریبی تعلقات استوار کرے گی ۔

1956ء کے آئین کے مطابق سربراہ مملکت کے لیے مسلمان ہونا لازم تھا ، نیز کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا جو قرآن و سنت میں درج اسلامی اصولوں کے منافی ہو ۔ آئین میں یہ بھی درج تھا کہ اگر کوئی موجودہ قانون اسلامی تعلیمات کے منافی ہو تو اس میں ترمیم کی جائے گی تا کہ وہ اسلامی تعلیمات سے متصادم نہ ہو ۔

آئین میں یہ بھی کہا گیا کہ صدر مملکت ایک ایسا کمیشن مقرر کرے گا جو موجودہ قوانین کا جائزہ لے کر انھیں اسلام کے مطابق ڈھالنے کی سفارشات کرے ۔

غیر مسلم اقلیتوں کی مذہبی آزادی اور دیگر حقوق کی قرار واقعی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ۔

1956ء کا آئین صرف اڑھائی سال چل سکا ۔ 7 اکتوبر 1958ء کو اس وقت کے صدر اسکندر مرزا نے 1956ء کا آئین منسوخ کر کے تمام اسمبلیاں توڑ دیں ۔ ملک میں مارشل لاء لگا دیا اور افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا ۔

27 اکتوبر 1958ء کو جنرل محمد ایوب خان نے اسکندر مرزا کو ہٹا کر خود صدارت کا عہدہ سنبھال لیا ۔ مارشل لاء حکومت نے دوسرے کاموں کے علاوہ آئین سازی کی طرف بھی توجہ دی ۔ یہ کام مرحلہ وار کیا گیا ۔ فروری 1960ء میں صدر نے ایک ریفرنڈم کے ذریعے بنیادی جمہوریت (بی ۔ ڈی) کے ممبران سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر کے چیف جسٹس آف پاکستان کی قیادت میں ایک آئینی کمیشن مقرر کیا ۔ اس کمیشن نے ملک کی سیاسی تاریخ اور آئینی مسائل کا جائزہ لینے کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کی رائے معلوم کی ۔ اس جائزے کے بعد کمیشن نے مئی 1961ء میں اپنی رپورٹ صدر مملکت کو پیش کی ۔ صدر نے وفاقی کابینہ کی ایک خصوصی کمیٹی کے مشورے سے نیز کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر ایک آئین تیار کروایا جسے 8 جون 1962ء کو ملک میں مارشل لاء اٹھا کر نافذ کر دیا گیا ۔ یہ آئین 1962ء کے آئین کے نام سے مشہور ہوا ۔ اس آئین کی 250 دفعات اور تین ضمیمے تھے ۔

1962ء کے آئین کی اسلامی دفعات

1956ء کے آئین کی طرح 1962ء کے آئین میں بھی پاکستان کے اسلامی تشخص کو تسلیم کرتے ہوئے آئین میں اسلامی دفعات کو نمایاں جگہ دی گئی۔

قرارداد مقاصد (1949ء) کو آئین کے افتتاحیہ میں شامل کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کو تمام اختیارات کا منبع اور مالک قرار دیتے ہوئے افتتاحیہ میں کہا گیا کہ قرآن اور سنت کی مقرر کردہ حدود میں رہ کر ہی عوام ان اختیارات کو استعمال کریں گے۔

1956ء کے آئین کی طرح مملکت کا نام اسلامیہ جمہوریہ پاکستان رکھا گیا اور صدر مملکت کے لیے مسلمان ہونا لازم قرار دیا گیا۔ اس آئین کی رو سے ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا جو قرآن اور سنت میں درج اسلامی اصولوں کے منافی ہو۔ اگر کوئی موجودہ قانون اسلامی تعلیمات سے متصادم ہو تو اس میں ضروری ترمیم کرنا ہوگی۔ حکومت کے لیے لازم تھا کہ وہ لوگوں کو ایسے مواقع فراہم کرے کہ لوگ اپنی زندگیاں اسلام کے اصولوں کے مطابق گزار سکیں۔ اس کے علاوہ آئین میں اسلامی ممالک سے قریبی تعلقات استوار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

1962ء کے آئین کی رو سے اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی جس میں ایسے لوگ شامل کیے گئے جو عالم دین ہونے کے علاوہ موجودہ قوانین کا جائزہ لے کر ان کے غیر اسلامی پہلوؤں کی نشان دہی کریں تاکہ ضروری تبدیلیوں کے بعد ان قوانین کو قرآن و سنت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جا سکے۔ یہ ادارہ نئے مسودات قوانین اور انتظامی فیصلوں کی اسلامی حیثیت کے بارے میں اپنی رائے دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کسی بھی مسئلے کے اسلامی پہلوؤں کے بارے میں صدر مملکت اس سے مشورہ کر سکتا تھا۔ اگرچہ اسلامی نظریاتی کونسل کے فیصلوں کی حکومت قانوناً پابند نہ تھی کیونکہ ان کی حیثیت صرف مشورے کی تھی، لیکن عملی طور پر اس ادارے کی سفارشات کو رد کرنا

صدر مملکت ، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے آسان نہ تھا ۔ اسلامی نظریاتی کونسل اپنی سالانہ رپورٹ صدر مملکت کی وساطت سے قومی اسمبلی کو پیش کرتی تھی ۔

ادارہ تحقیقات اسلامیہ کا قیام عمل میں لایا گیا تا کہ جدید تقاضوں کے مطابق عوام کی رہنمائی کے لیے اسلامی فقہ اور تاریخ کی تحقیق اور مطالعہ کے عمل کو فروغ دیا جا سکے ۔

1962ء کا آئین قریباً پونے سات سال نافذ العمل رہا ۔ 1968ء کے آواخر میں صدر محمد ایوب خاں کی حکومت کے خلاف عوامی تحریک شروع ہوئی جو 1969ء کے ابتدائی مہینوں میں شدت اختیار کر گئی ۔ اس وجہ سے 25 مارچ 1969ء کو انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور اختیارات بری فوج کے سربراہ جنرل محمد یحییٰ خاں کے سپرد کر دیے جنھوں نے 1962ء کے آئین کو منسوخ کرکے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا ۔

مارشل لاء حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہوئے وعدہ کیا کہ ملک کے لیے نیا آئین ایک منتخب شدہ قومی اسمبلی بنائے گی جس کے ممبران کا انتخاب بالغ رائے دہی کے اصول کے تحت براہ راست کروایا جائے گا ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے لیگل فریم ورک آرڈر (LFO) مارچ 1970ء میں جاری کیا گیا ۔ اس لیگل فریم ورک آرڈر میں نہ صرف قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کی تعداد اور انتخابات کے لیے عمومی ہدایات کا تعین کیا گیا بلکہ ملک کے آئندہ آئین کے لیے مندرجہ ذیل بنیادی اصول بھی وضع کر دیے گئے :

(i) پاکستان میں وفاقی نظام ہوگا اور آئین میں ملکی آزادی ، سالمیت اور قومی یک جہتی کی ضمانت دی جائے گی ۔

(ii) نظریۂ اسلام جو کہ پاکستان کے قیام کی بنیاد ہے ، کا تحفظ کیا جائے گا اور سربراہ مملکت کا مسلمان ہونا ضروری ہو گا ۔

(iii) آئین جمہوری ہوگا جس میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات ،

بنیادی حقوق اور آزاد عدلیہ کی ضمانت موجود ہوگی۔

(iv) اختیارات کو اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ (Maximum) صوبائی خود مختاری حاصل ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ وفاقی حکومت کو قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی اختیارات اس حد تک حاصل ہوں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو بطریق احسن نبھا سکے۔

(v) قومی امور میں شرکت کے لیے تمام لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں گے اور ملک میں موجود تفاوت (Disparity) خصوصاً اقتصادی تفاوت کو ختم کرنے کی طرف توجہ دی جائے گی۔

دسمبر 1970ء میں اس لیگل فریم ورک آرڈر کے مطابق قومی اسمبلی کے لیے انتخابات منعقد کیے گئے۔ تمام بڑی سیاسی جماعتوں نے ان انتخابات میں حصہ لیا۔ قبل اس کے کہ انتخابات میں کامیاب ہونے والی بڑی سیاسی جماعتیں ملک کے لیے نیا آئین تیار کرتیں، اندرون ملک اور کچھ بیرونی عناصر کی ملی بھگت سے مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو گئی جو بعد میں پاکستان اور بھارت کی جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ اس کے نتیجے میں 16 دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان ہم سے کٹ کر مملکت بنگلہ دیش بن گیا۔ اس واقعہ کے چار روز بعد یعنی 20 دسمبر 1971ء کو فوجی حکومت نے اقتدار پیپلز پارٹی کے چئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کر دیا۔

اپریل 1972ء میں ملک میں مارشل لاء ختم کرکے ایک عبوری آئین نافذ کیا گیا۔ مستقل آئین کی تیاری کے لیے 1970ء کے انتخابات میں مغربی پاکستان سے منتخب شدہ ممبران قومی اسمبلی میں سے 25 ممبران پر مشتمل ایک خصوصی کمیٹی قائم کی گئی، جس میں تمام بڑی سیاسی جماعتوں کو نمائندگی دی گئی۔ حزب اختلاف کو بھی خاطر خواہ نمائندگی دی گئی۔ اس کمیٹی نے باہم مشورے سے آئین کا مسودہ تیار کیا۔ اس مسودے کو بحث و تمحیص اور کچھ

ترامیم کے ساتھ قومی اسمبلی نے 10 اپریل 1973ء کو متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ 12 اپریل 1973ء کو صدر مملکت نے آئین پر دستخط کیے۔ 14 اگست 1973ء سے اس آئین پر عمل درآمد شروع ہوا۔ اسے 1973ء کے آئین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

1973ء کے آئین کی اسلامی دفعات

اس آئین میں بیشتر اسلامی دفعات وہی ہیں جو 1956ء اور 1962ء کے آئینوں میں تھیں۔ البتہ کچھ نئی دفعات بھی شامل کی گئی ہیں۔

ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا اور پہلی بار اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ پاکستان کے کسی سابقہ آئین میں وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ آئین اور قانون کی رو سے مسلمان اور غیر مسلم میں تمیز کس طرح کی جائے گی۔ 1974ء میں ایک ترمیم کے ذریعے مسلمان کی تعریف کو آئین کا حصہ بنایا گیا۔ آئین کی رو سے وہ شخص مسلمان متصور ہوگا جو خدا کی وحدانیت اور پیغمبرؐ اسلام پر خدا کے آخری نبی کی حیثیت سے مکمل یقین رکھتا ہو۔

سابقہ آئینوں کی طرح قرارداد مقاصد کو معمولی ترمیم کے ساتھ افتتاحیہ میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کائنات پر خدا تعالٰی کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ اختیارات کو خدا کی طرف سے مقدس امانت سمجھتے ہوئے نیز قرآن اور سنت کی مقرر کردہ حدود میں رہ کر عوام استعمال کریں گے۔

صدر مملکت اور وزیر اعظم کے لیے لازم ہے کہ وہ مسلمان ہوں۔ صدر اور وزیر اعظم کے علاوہ صوبائی گورنروں، مرکزی اور صوبائی وزرا، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اسپیکروں اور سینٹ کے چئرمین کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے عہدوں کا حلف اٹھاتے وقت اسلامی نظریے کی حفاظت کا اقرار کریں۔

تمام رائج الوقت قوانین کو قرآن اور سنت کے مطابق بنانے کی ضرورت پر

زور دیا گیا ہے اور آئندہ ایسے قوانین بنانے سے گریز کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہوں ۔ 1962ء کے آئین کی طرح 1973ء کے آئین میں اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی ہے ۔ اس کونسل کے بنیادی فرائض یہ ہیں :

(i) اسلامی اصولوں کی روشنی میں تمام مروجہ قوانین پر نظرثانی کرنا ۔
(ii) ایسے اقدامات کی سفارش کرنا جن کے ذریعے پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں اسلامی قوانین وضع کریں ۔

اس کونسل کے فیصلوں کی حیثیت سفارش کی تھی لیکن عموماً حکومت نے ان سفارشات کو نظر انداز نہیں کیا ۔

حکمت عملی کے اصولوں میں کہا گیا کہ حکومت ایسے اقدامات کرے گی جن سے لوگوں کے لیے ممکن ہو کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگیاں گزار سکیں ۔

اسلامی تعلیمات اور عربی زبان کے فروغ اور اغلاط سے پاک قرآن مجید کی اشاعت کی گئی ۔ زکٰوۃ ، اوقاف اور مساجد کے بہتر انتظام کا عہد کیا گیا ۔

اسلامی اتحاد کو فروغ دینے کے لیے تمام اسلامی ممالک سے قریبی تعلقات استوار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ۔

مارچ 1977ء میں ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے ۔ برسراقتدار پیپلز پارٹی اور حزب مخالف کی نو سیاسی جماعتوں پر مشتمل پاکستان قومی اتحاد (PNA) Pakistan National Alliance کے درمیان مقابلہ ہوا ۔ اگرچہ ان انتخابات میں پیپلز پارٹی کو کامیابی ہوئی لیکن انتخابات کے دوران میں شدید دھاندلیوں کی شکایات کی وجہ سے قومی اتحاد نے حکومت کے خلاف عوامی تحریک شروع کی جو بہت تیزی سے ملک بھر میں پھیل گئی ۔ اس تحریک کے دو بڑے مطالبے تھے :

اول ، انتخابات دوبارہ کروائے جائیں ۔

دوم ، ملک میں نظامِ مصطفیٰ یا اسلامی نظام فوری طور پر رائج کیا جائے ۔

جب حکومت اور پاکستان قومی اتحاد کے مابین کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور ملک میں سیاسی ابتری پھیلنے لگی تو 5 جولائی 1977ء کو فوج نے جنرل ضیاءالحق کی قیادت میں اقتدار سنبھال لیا ۔ 1973ء کے آئین کے بیشتر حصوں کو معطل کر کے مارشل لا نافذ کر دیا ۔ مارشل لا انتظامیہ نے وعدہ کیا کہ انتخابات منعقد کروا کے عنان حکومت منتخب نمائندوں کے سپرد کر دیا جائے گا ۔

کچھ عرصے کے بعد حکومت نے محسوس کیا کہ 1973ء کے آئین کے نافذ شدہ حصے جملہ انتظامی امور کے طے کرنے کے لیے ناکافی تھے ۔ چنانچہ ان مختلف قانونی اور آئینی پیچیدگیوں کو دور کرنے کے لیے مارچ 1981ء میں عبوری آئین نافذ کیا گیا جس میں 1973ء کے آئین کی بیشتر دفعات کو شامل کیا گیا ۔ جہاں تک اسلامی دفعات کا تعلق ہے ، 1981ء کے عبوری آئین میں وہ تمام اسلامی دفعات شامل تھیں جو 1973ء کے آئین کا حصہ تھیں ۔

دسمبر 1984ء میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنے حق میں قوم سے ریفرنڈم کے ذریعے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا ۔ اس کے بعد فروری 1985ء میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے ۔ مارچ 1985ء میں سینٹ اور مخصوص نشستوں کے انتخابات مکمل ہوئے جس کے ساتھ ہی پارلیمنٹ کی تشکیل مکمل ہو گئی ۔

دریں اثنا 1973ء کے آئین کو بعض ترامیم کے ساتھ نافذ کر دیا گیا ۔ 23 مارچ 1985ء کو جنرل محمد ضیاء الحق نے منتخب صدر پاکستان کی حیثیت سے حلف وفاداری اٹھایا ۔ اسی دن وزیراعظم پاکستان نے بھی حلف وفاداری اٹھایا اور اس طرح 23 مارچ 1985ء کو ملک میں جمہوری نظام باقاعدہ طور پر نافذ ہو گیا ۔

29 مئی 1988ء کو صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے جناب محمد خان جونیجو کی حکومت کو برطرف کردیا ۔ قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور اس کے بعد اعلان کیا گیا کہ ملک میں 16 نومبر 1988ء کو عام انتخابات کرائے جائیں گے ۔

17 اگست 1988ء کو صدر جنرل محمد ضیاء الحق کا ایک ہوائی حادثہ میں انتقال ہو گیا ۔ سینیٹ کے چیرمین جناب غلام اسحاق خان نے قائم مقام صدر مملکت کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ عام انتخابات پروگرام کے مطابق 16 نومبر 1988ء کو ہی ہونگے ۔

16 نومبر 1988ء کو قومی اسمبلی کے اور 19 نومبر 1988ء کو چاروں صوبائی اسمبلیوں کے لئے عام انتخابات منعقد ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں قائم مقام صدر نے بینظیر بھٹو صاحبہ کو ملک کا وزیراعظم نامزد کیا۔

انہوں نے 2 دسمبر 1988ء کو ملک کے وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اسی دن صوبائی حکومتوں کے وزراء اعلیٰ بھی منتخب ہوئے۔

12 دسمبر 1988ء کو صدر مملکت کا انتخاب ہوا اور جناب غلام اسحاق خان کو آئندہ پانچ سالوں کے لئے ملک کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ 13 دسمبر 1988ء کو انہوں نے حلف وفاداری اٹھایا۔ اسی ہی دن بینظیر صاحبہ نے قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔

6 اگست 1990ء کو صدر مملکت نے بعض وجوہات کی بنا پر وزیر اعظم بینظیر بھٹو صاحبہ کو برطرف کر کے قومی اسمبلی توڑ دی اور 24 اکتوبر 1990ء کو ملک میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔

پروگرام کے مطابق ملک میں 24 اکتوبر 1990ء کو قومی اسمبلی اور 27 اکتوبر 1990ء کو چاروں صوبائی اسمبلیوں کے عام انتخابات منعقد ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں اسلامی جمہوری اتحاد کے رہنما جناب محمد نواز شریف نے 6 نومبر 1990ء کو پاکستان کے وزیر اعظم کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد صوبائی وزراء اعلی کا بھی انتخاب ہوا۔ یہ نئی حکومت عوام کی بہبود کے لیے کام کررہی ہے۔

اسلامی نظام کے نفاذ کی کوششیں

پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی کوششوں کا آغاز قیام پاکستان کے فوراً بعد ہوا۔ قرارداد مقاصد کی منظوری اور تینوں آئینوں میں اسلامی دفعات کو جگہ دینا، اسی مقصد کے حصول کی جانب اہم اقدامات تھے۔ اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کا ذکر بہت ضروری ہے جس نے قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے میں گرانقدر کام کیا۔ اسلامی نظریۂ حیات کو فروغ دینے اور اسلامی شعار کے نفاذ کے لیے دیگر کئی اقدامات بھی کیے گئے۔

1977ء کی نظام مصطفیٰ تحریک کے دوران یہ بات واضح ہو گئی کہ پاکستان کے عوام اس بات کے خواہاں ہیں کہ مکمل اسلامی نظام تیزی سے نافذ کیا جائے۔ اس عوامی مطالبے کے پیش نظر 1977ء میں قائم ہونے والی مارشل لا

حکومت نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی طرف خصوصی توجہ دی ۔ اس ضمن میں اہم اقدامات کا تذکرہ درج ذیل ہے :

1980ء میں پہلی بار سرکاری طور پر زکوٰۃ کا نظام رائج کیا گیا جس کی رو سے ہر سال یکم رمضان کو ہر مسلمان کے سیونگ اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم ، سرمایہ کاری اور اثاثوں پر اسلامی شرح کے مطابق اڑھائی فی صد سالانہ کے حساب سے زکوٰۃ وضع کی جاتی ہے ۔ اگر کوئی مسلمان حلفی بیان دے کہ اس کے فقہ کے مطابق حکومت کو زکوٰۃ دینا درست نہیں تو اسے زکوٰۃ کے مذکورہ طریق کار سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے ۔ زکوٰۃ کے طور پر حاصل شدہ رقوم کو غربا اور مساکین کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے زکوٰۃ کمیٹیاں بھی تشکیل دی جا چکی ہیں ۔

زرعی پیداوار پر عشر نافذ کیا گیا ہے جو کہ پیداوار کا دسواں حصہ ہوتا ہے ۔ اس طرح حاصل شدہ آمدنی سے رفاہی اداروں اور مستحق افراد کی مالی امداد کی جاتی ہے ۔

نظام عدل کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے 1979ء میں صوبائی ہائی کورٹوں میں شریعت بنچ قائم کیے گئے ۔ بعد میں ان بنچوں کی جگہ ایک وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی جس کا صدر دفتر اسلام آباد میں ہے لیکن یہ دوسرے مقامات پر بھی اپنی کارروائی کر سکتی ہے ۔ یہ عدالت اسلامی تعلیمات کے منافی قوانین اور انتظامی اقدامات کو غیر مؤثر اور غیر قانونی قرار دے سکتی ہے ، اس کے فیصلوں کے خلاف سپریم کورٹ کے شرعی اپیل بنچ میں اپیل کی جا سکتی ہے ۔ وفاقی شرعی عدالت میں قانون دان اور علما حضرات کو جج مقرر کیا گیا ہے ۔

مختلف جرائم مثلاً چوری ، شراب نوشی اور زنا وغیرہ کے لیے اسلامی سزائیں نافذ کی گئی ہیں ۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ عدالتی نظام کی نچلی سطح پر قاضی عدالتیں قائم کی جائیں تا کہ عوام کو جلد اور سستا انصاف مہیا کیا جا سکے

حکومت نے ایک مرحلہ وار پروگرام کے تحت بنکاری کے نظام کو سود کی لعنت سے پاک کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں ۔ یکم جنوری 1981ء سے

بنکوں میں نفع اور نقصان کی بنیاد پر اکاؤنٹ کھولنے کا آغاز کیا گیا - اس نئے نظام میں عوام کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نفع اور نقصان کے کھاتوں میں جمع شدہ رقوم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے - حکومت کی کوشش سے اس سلسلے میں اقدامات بھی کیے گئے اور 1985ء سے ہمارا بنکاری نظام مکمل طور سے اسلامی تقاضوں کے عین مطابق ہو گیا ہے -

نماز قائم کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات نہایت واضح اور جامع ہیں - اس لیے حکومت پاکستان نے نیک اور صالح لوگوں کو رضا کارانہ حیثیت میں ناظمین صلٰوۃ مقرر کیا تا کہ یہ لوگ اپنے اپنے علاقوں میں دوسرے بھائیوں کو نماز پنجگانہ کی تلقین کریں -

معاشرے میں اسلامی شعار اور قدروں کو فروغ دینے کے لیے حکومت خصوصی اہتمام کر رہی ہے - عریانی، فحاشی اور دیگر معاشرتی برائیوں کی روک تھام کے لیے سخت قوانین نافذ کیے گئے ہیں - 'چادر اور چار دیواری' کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا ہے - ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم، اخبار و رسائل کو ہدایت کی گئی ہے کہ اسلامی رجحانات اور اسلامی قدروں کی اشاعت کریں - ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اذان، تلاوت کلام پاک، عربی تدریس نیز اسلامی اور اخلاقی پروگراموں کا سلسلہ باقاعدگی سے شروع کیا گیا ہے - دفتروں میں نماز باجماعت اور ماہ رمضان المبارک میں حسنِ قرات کے مقابلوں اور شبینہ محفلوں کا سرکاری طور پر اہتمام کیا جاتا ہے -

تعلیم اور تدریس کے عمل کو اسلامی قدروں سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کے لیے 1979ء میں تعلیمی پالیسی پر نظرثانی کی گئی - اسلامی تعلیمات اور تحریک پاکستان کی نظریاتی اساس سے نوجوانوں میں لگاؤ بڑھانے کے لیے تعلیمی نصاب میں ضروری تبدیلیاں کی گئیں جن کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کلاسوں میں اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو لازمی مضامین کے طور پر شامل کیا گیا ہے - اسی طرح سکولوں میں قرآن مجید کی تدریس کا بہتر انتظام کیا گیا ہے -

مختلف یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی تعلیم کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے ہیں ۔ اسلام آباد میں نئی اسلامی یونیورسٹی قائم کی گئی ہے جو کہ اسلامی علوم کی تعلیم و تحقیق پر خصوصی توجہ دے رہی ہے ۔ دینی مدرسوں کی حالت بہتر کرنے کے لیے انھیں ضروری مالی امداد دی جا رہی ہے ۔ مکتب سکیم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔

خواتین کے لیے علیٰحدہ یونیورسٹیاں قائم کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جا رہے ہیں ۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کی گئی ہے تا کہ تمام مکاتب فکر کے علما کو نمائندگی دی جا سکے ۔ یہ کونسل مروجہ قوانین کا جائزہ لے رہی ہے تا کہ اگر ان قوانین اور اسلامی اصولوں میں کوئی تضاد ہو تو اسے فوراً رفع کیا جائے ۔

حکومت نے اس بات کی طرف خصوصی توجہ دی ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اسلام کا نام لے کر فرقہ وارانہ ، لسانی اور علاقائی تعصبات کو ہوا نہ دے ۔ اسلامی رواداری کو فروغ دینے کے لیے متعصبانہ تحریروں اور تقاریر کا سختی سے محاسبہ کیا جا رہا ہے ۔

ملک میں ضرورتمند اور مستحق افراد کی مالی مدد کے لیے 1992ء سے بیت المال قائم کیا گیا ہے ۔

غرضیکہ ملک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بھرپور کوششیں کی جا رہی ہیں ۔ اس ضمن میں قابل قدر اقدامات کیے گئے ہیں اور مستقبل میں مزید اقدامات کیے جائیں گے جس کے نتیجے میں ہمارے ملک میں ایسا اسلامی نظام رائج ہو جائے گا جس کا خواب بانیان پاکستان نے دیکھا تھا ۔ اس سے قومی یک جہتی کو فروغ ملے گا اور ہمارا قومی تشخص اجاگر ہو گا ۔ پاکستان کے شہریوں خصوصاً نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی کوششوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں ۔

سوالات

(الف) مختصر جواب دیں :

1۔ قرارداد مقاصد، پاکستان کی آئین سازی کی تاریخ میں بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے ۔ وضاحت کریں ۔ نیز اس کی بنیادی خصوصیات لکھیں ۔

2۔ 1956ء کے آئین میں اسلام کو پاکستان کے تشخص اور سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے ۔ مختصر جائزہ پیش کریں ۔

3۔ 1969ء سے 1973ء کے درمیان پاکستان میں جو سیاسی و آئینی پیش رفت ہوئی ، اس کا مختصر حال لکھیں ۔

4۔ 1973ء کے آئین کی اہم اسلامی دفعات کا جائزہ پیش کریں ۔

5۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جو کوششیں کی گئی ہیں ان کا تفصیلی جائزہ پیش کریں ۔

(ب) درست کے آگے ✓ کا نشان لگائیں :

1۔ قیام پاکستان کے بعد کاروبار سیاست چلانے کے لیے حکومت ہند کے قانون مجریہ 1935ء کو ضروری ترامیم کے ساتھ عبوری آئین کے طور پر نافذ کیا گیا ۔

2۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے ممبران 46_1945ء کے انتخابات کے نتیجہ میں ان علاقوں سے منتخب ہوئے جو بعد میں پاکستان میں شامل ہوئے ۔

3۔ 7-1 اکتوبر 1958ء کو فوج نے اقتدار سنبھالا ۔

4۔ 8-1 اکتوبر 1962ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ۔

5۔ مشرقی پاکستان ہم سے ــــ میں کٹ کر مملکت بنگلہ دیش بن گیا ۔
(1971ء ـ 1969ء ـ 1966ء)

6- ملک میں پہلی بار سرکاری طور پر زکوٰۃ کا نظام ــــ میں رائج کیا گیا۔
(1980ء – 1983ء – 1978ء)

7- عشر زرعی پیداوار کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔

8- نظام عدل کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے ــــ قائم کیے گئے ہیں۔ (شریعت بنچ ، ڈویژن بنچ ،اسپیشل بنچ)

9- وفاقی شرعی عدالت کا صدر دفتر ــــ میں ہے۔
(لاہور ، کراچی ، اسلام آباد)

10- ــــ سے بنکوں میں نفع اور نقصان کی بنیاد پر اکاؤنٹ کھولنے کا آغاز کیا گیا۔ (یکم جنوری 1981ء ، 11 ستمبر 1983ء)

(ج) مختصر جواب دیں :

1- محمد علی فارمولا کیا تھا ؟

2- قرارداد مقاصد کب منظور کی گئی ؟

3- پاکستان میں آئین سازی کی تاریخ میں 1955ء میں- کون سا اہم واقعہ ہوا۔

4- 1956ء کا آئین کتنی مدت کے لیے چل سکا ؟

5- 1962ء کے آئین کی رو سے قوانین کے غیر اسلامی پہلوؤں کی نشاندہی کرنے کے لیے جو کونسل بنائی گئی ، اس کا نام لکھیں۔

6- 1962ء کا آئین کتنا عرصہ نافذ العمل رہا ؟

7- لیگل فریم ورک آرڈر کب جاری کیا گیا ؟

8- لیگل فریم ورک آرڈر کے مطابق قومی اسمبلی کے انتخابات کب ہوئے۔

9- چادر اور چار دیواری کے تحفظ سے کیا مراد ہے ؟

10- تدریس اور تعلیم کے عمل کو اسلامی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے تعلیمی پالیسی پر کب نظرثانی کی گئی۔



ارضِ پاکستان

پاکستان کا محل وقوع

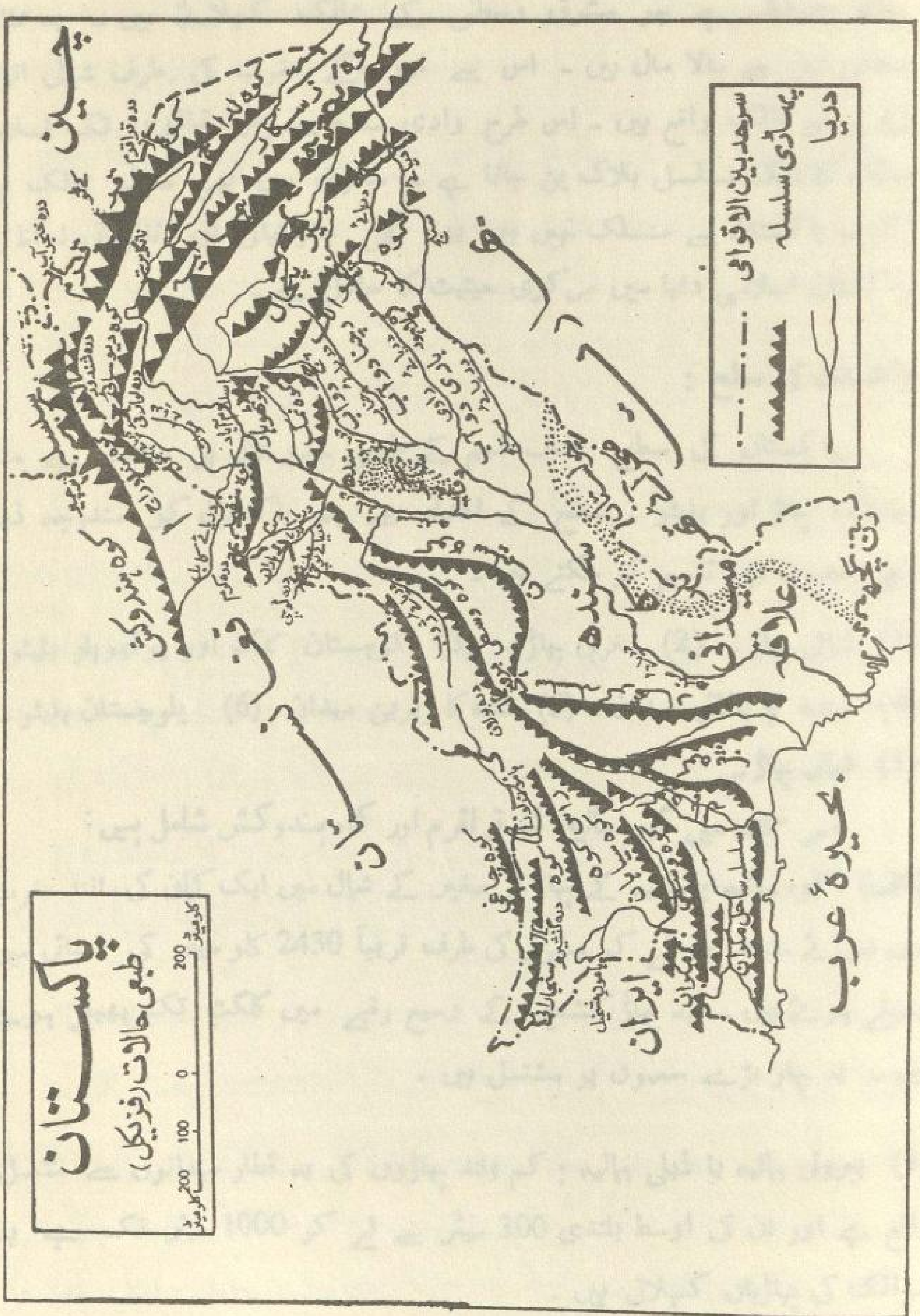
ایشیا کے طبعی نقشے پر نظر ڈالیں تو براعظم ایشیا کے جنوب میں ایک جزیرہ نما قطعہ زمین واقع ہے - یہ برصغیر پاک و ہند ہے جس کو ہمالیہ پہاڑ اور اس کی شاخیں براعظم کے شمالی حصے سے جدا کرتی ہیں - برصغیر کے مغرب میں سر زمینِ پاکستان واقع ہے -

شمال میں پاکستان کی سرحد چین سے ملتی ہے - شمال مغرب میں افغانستان واقع ہے - مغرب میں ایران ہے - پاکستان کے مشرق میں بھارت اور جنوب میں بحیرۂ عرب ہے -

وسعت کے اعتبار سے پاکستان °23.45 اور °36.75 شمالی عرض بلد اور °61 اور °75.5 مشرقی طول بلد کے درمیان پھیلا ہوا ہے اس کا کل رقبہ 796096 مربع کلومیٹر ہے -

محل وقوع کی اہمیت :

جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے پاکستان دنیا میں اہم حیثیت رکھتا ہے - اس کے علاوہ پاکستان کو اسلامی ممالک میں ایک اہم بین الاقوامی


پاکستان
طبعی حالات (فزیکل)
چین
بحیرۂ عرب
ایران
سرحد بین الاقوامی
پہاڑی سلسلہ
دریا

حیثیت حاصل ہے۔ یہ جنوب مغربی ایشیا کے ان اسلامی ممالک کے ساتھ منسلک ہے جو مشرق وسطیٰ کے ممالک کہلاتے ہیں۔ یہ ممالک معدنی تیل سے مالا مال ہیں۔ اس سے اور آگے مغرب کی طرف شمالی افریقہ کے مسلم ممالک واقع ہیں۔ اس طرح وادی سندھ سے بحر اوقیانوس تک اسلامی ممالک کا ایک مسلسل بلاک بن جاتا ہے۔ مشرق میں بھی مسلم ممالک ہیں اگرچہ پاکستان سے منسلک نہیں ہیں پھر بھی جغرافیائی اور نظریاتی لحاظ سے پاکستان اسلامی دنیا میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔

پاکستان کی سطح :

پاکستان کی سطح مختلف قسم کے طبعی خدو خال پر مشتمل ہے مثلاً میدان، پہاڑ اور پلیٹو۔ سطح کے اعتبار سے ہم پاکستان کو مندرجہ ذیل چھے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(1) شمالی پہاڑ۔ (2) مغربی پہاڑ۔ (3) کوہستان نمک اور پوٹھوہار پلیٹو۔
(4) سندھ کا بالائی میدان۔ (5) سندھ کا زیرین میدان (6) بلوچستان پلیٹو۔

(1) شمالی پہاڑ۔

اس حصے میں کوہ ہمالیہ، کوہ قراقرم اور کوہ ہندوکش شامل ہیں :

(الف) کوہ ہمالیہ : ہمالیہ کے پہاڑ بر صغیر کے شمال میں ایک کمان کی مانند مغرب میں دریائے سندھ سے لے کر مشرق کی طرف قریباً 2430 کلو میٹر کی لمبائی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ پہاڑ کشمیر کے وسیع رقبے میں گلگت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ چار بڑے حصوں پر مشتمل ہیں۔

(i) بیرونی ہمالیہ یا ذیلی ہمالیہ : کم بلند پہاڑوں کی یہ قطار میدانوں سے متصل واقع ہے اور ان کی اوسط بلندی 300 میٹر سے لے کر 1000 میٹر تک ہے یہ شوالک کی پہاڑیاں کہلاتی ہیں۔

(2) ہمالیہ صغیر کے پہاڑی سلسلے : یہ پہاڑ شمال کی طرف شوالک کے متوازی واقع ہیں - پیر پنجال ان سلسلوں میں سے ایک ہے جس کی اوسط بلندی قریب 4600میٹر ہے -

(3) ہمالیہ کبیر کے پہاڑی سلسلے : یہ کوہ پیر پنجال کے شمال میں واقع ہیں - جن کی اوسط بلندی ساڑھے چھے ہزار میٹر ہے - یہ مستقل طور پر برف پوش رہتے ہیں - اس سلسلے میں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں پائی جاتی ہیں - کشمیر میں ننگا پربت قریباً 8250 میٹر پیر پنجال اور ہمالیہ کبیر کے درمیان کشمیر کی مشہور وادی ہے -

(4) کوہ لداخ : ہمالیہ کبیر کے شمال میں لداخ کا پہاڑی سلسلہ ہے جسے اندرونی ہمالیہ بھی کہتے ہیں -

(ب) کوہ قراقرم : شمالی کشمیر اور گلگت میں ہمالیہ کے شمال کی طرف کوہ قراقرم واقع ہے جس کی اوسط بلندی 7000 میٹر ہے - اس کی بلند ترین چوٹی گوڈ ون آسٹن (کے - ٹو) ہے جو کہ 8611 میٹر اونچی ہے -

(ج) کوہ ہندوکش : قراقرم کے شمال مغرب میں کوہ ہندوکش کے سلسلے ہیں اس کی بلند ترین چوٹی ترچ میر ہے -

شمالی پہاڑوں کی اہمیت :

یہ پہاڑ وسطی ایشیا اور پاکستان کے درمیان نقل و حرکت میں ایک بڑی سد راہ ہیں - یہ پہاڑ بحیرہ عرب اور خلیج بنگال سے آنے والی ہواؤں کو بھی روکتے ہیں اور بارش کا موجب بنتے ہیں - ان کی زیادہ بلند چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں - برف موسم بہار اور موسم گرما میں پگھلتی ہے اور دریاؤں

کو پانی مہیا کرتی ہے ۔ یہ پہاڑ موسم سرما میں وسطی ایشیا کی سرد ہواؤں سے ہمارے میدانوں کو محفوظ رکھتے ہیں ۔ بہت سے پہاڑی سلسلوں کی جنوبی بارشی ڈھلانوں پر بہت عمدہ اور گراں قیمت عمارتی لکڑی کے جنگلات پائے جاتے ہیں ۔ البتہ شمالی علاقوں میں ہمالیہ کبیر کی اوٹ میں خشک وادیاں اور پہاڑ واقع ہیں ۔ ان بلند شمالی پہاڑوں میں صرف چند ایک درے موجود ہیں لیکن ان کے ذریعے آمد و رفت کافی مشکل ہے ۔

2۔ مغربی پہاڑی سلسلے :

مغربی پہاڑی سلسلے زیادہ تر شمالاً جنوباً پھیلے ہوئے ہیں ۔ کوہ ہندوکش کے کچھ پہاڑوں کے سلسلے مغرب کی طرف مڑ جاتے ہیں ۔ ان سلسلوں کو شمالاً جنوباً پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

1۔ سوات اور چترال کے پہاڑ : کوہ ہندوکش سے جنوب کی طرف تین چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں ۔ ان سلسلوں کے درمیان دریائے سوات دریائے چترال ، کنہار اور پنجکوڑا بہتے ہیں ۔ یہاں درہ لواری ہے جو چترال اور پشاور کے درمیان واقع ہے ۔

2۔ کوہ سفید : دریائے کابل کے جنوب میں کوہ سفید کا سلسلہ واقع ہے جو شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے ۔ اس کی اوسط بلندی 3600 میٹر ہے ۔ دریائے کابل کے جنوب میں درہ خیبر بھی واقع ہے جو کابل کو پشاور سے ملاتا ہے ۔ درے کی کل لمبائی 56 کلو میٹر ہے ۔ دریائے کرم ان پہاڑوں کے جنوب میں واقع ہے ۔ اس دریا کی وادی سے افغانستان جانے کا آسان راستہ ہے ۔

3۔ وزیرستان کا کوہستانی علاقہ : دریائے کرم اور گومل کے درمیان وزیرستان کا کوہستانی علاقہ ہے ۔ درہ ٹوچی اور درہ گومل افغانستان جانے کے لیے اہم درے ہیں ۔

4 ۔ **کوہ سلیمان :** دریائے گومل سے جنوب میں کوہ سلیمان کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں ۔ ان سلسلوں کی سب سے بلند چوٹی تخت سلیمان ہے جس کی بلندی قریباً 3500 میٹر ہے اس علاقے کا اہم دریا ، دریائے بولان ہے اس دریائی وادی میں درہ بولان واقع ہے ۔

5۔ **کوہ کھیر تھر :** کوہ سلیمان کے جنوب میں دریائے سندھ کی زیریں وادی کے مغرب کے ساتھ ساتھ کوہ کھیرتھر واقع ہے یہ کم بلند اور خشک پہاڑ ہیں ۔ کوہ کھیرتھر جنوبی سلسلے ہیں دریائے حب اور لیاری بہتے ہیں جو کراچی کے قریب بحیرۂ عرب میں گرتے ہیں ۔

(3) کوہستان نمک اور پوٹھوہار پلیٹو :

کوہستان نمک کا سلسہ جہلم کے قریب سے کالا باغ تک پہنچ کر دریائے سندھ کے پار نکل جاتا ہے ۔ کوہ نمک کے سلسلوں کی اوسط بلندی قریباً 700 میٹر ہے لیکن سکیسر کے قریب یہ سطح سمندر سے قریباً 1500 میٹر بلند ہے ۔ اس پہاڑ میں لاہوری نمک کی افراط اور دوسری معدنیات مثلاً جپسم اور کوئلہ پائے جاتے ہیں ۔ کوہستان نمک کے شمال میں پوٹھوہار پلیٹو واقع ہے جو سطح سمندر سے قریباً 300 میٹر سے 600 میٹر تک بلند ہے ۔ اس پلیٹو کا بیشتر حصہ بہتے ہوئے پانی نے تراش دیا ہے اور کاٹ رکھا ہے ۔ چنانچہ یہاں مختلف قسم کے مناظر پیدا ہو گئے ہیں ۔ نشیبی میدان اور قطع شدہ پست میدان پلیٹو کے سطحی منظر کے نمایاں خدو خال ہیں ۔ پلیٹو کے کچھ حصوں میں معدنی تیل کی پیداوار خاصی اہمیت رکھتی ہے ۔

4۔ سندھ کا بالائی میدان :

کوہستان ہمالیہ اور سلسلہ نمک کے جنوب میں ایک وسیع میدان ہے جو جنوب میں بحیرہ عرب تک چلا گیا ہے ۔ دریائے سندھ اور اس کے پانچ معاون

ستلج ، بیاس ، راوی ، چناب اور جہلم اس کو سیراب کرتے ہیں ۔ میدان کا شمالی مشرقی حصہ قریباً 183 میٹر سے 304 میٹر تک بلند ہے ۔ میدان کا بہت سا حصہ نہروں اور دریاؤں سے سیراب کیا گیا ہے ۔ اس کے جنوب مشرق میں تھر کا ریگستان ہے جو ہندوستان سے پاکستان میں پھیلتا چلا آیا ہے ۔ بہاولپور میں اس ریگستانی علاقے کو چولستان کہتے ہیں اور خیرپور میں نارا جہلم کے مغرب کی طرف تھل کا ریگستان ہے جس کو نہریں کھود کر بحال کیا گیا ہے

دو دریاؤں کی درمیانی زمین دو آبہ کہلاتی ہے اس لیے پنجاب کا میدان کئی دوابوں میں تقسیم ہے ۔ دو آبے کے وسط میں زمین بلند ہو کر ایک مرتفع میدان بن گئی ہے جسے ، بار ، کہتے ہیں ۔ آبپاشی کی مدد سے دوابوں کے قدیم ، خشک اور غیر آباد حصے نہایت خوشحال زرعی علاقے بن گئے ہیں ۔ ان کی مٹی عام طور پر زرخیز ہے ۔

سندھ کے مغرب کی طرف کوہ دامنی میدان ہے جسے 'ڈیرہ جات' کہتے ہیں ۔ یہاں پہاڑوں کی طرف سے بے شمار برساتی نالے دامنی میدان پر مغرب سے مشرق کی طرف کھلی گہری کم گہری یا کٹی ہوئی وادیوں میں بہتے ہیں ۔ یہ موسم گرما میں خشک ہوتے ہیں اور ان میں سے بہت سے کم دریائے سندھ تک پہنچ پاتے ہیں ۔

پشاور کا میدان ایک قسم کا نخلستان ہے جس کو تین اطراف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے اور چوتھی طرف سے مشرق میں پوٹھوہار کی جانب کھلا ہے ۔ اس کو دریائے کابل سیراب کرتا ہے جو وارسک کے مقام پر پہاڑوں سے ایک تنگ گھاٹی سے گذر کر مشرق کی طرف بہتا ہوا اٹک کے مقام کے قریب سندھ میں جا ملتا ہے ۔ سارا سال پانی کی فراوانی اور زرخیز سیلابی مٹی کی وجہ سے یہ ملک کا سب سے زیادہ پیداوار کا علاقہ بن گیا ہے ۔

5۔ سندھ کا زیریں میدان :

مٹھن کوٹ سے نیچے سندھ اپنے پانچ معاونوں کا پانی ساتھ لے کر ایک

بہت بڑے دریا کی صورت میں بہتا ہے اور طغیانی کے وقت اس کی وسعت کئی کلومیٹر ہو جاتی ہے۔ اس حصے میں دریا بہت آہستہ آہستہ بہتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سی ریت مٹی وغیرہ اس کی تہ میں جمع ہو گئی ہے اور دریا کے دونوں طرف زمینوں کو محفوظ کرنے کے لیے بند تعمیر کیے گئے ہیں۔ وسطی میدان کا علاقہ جو دریائے سندھ کے بائیں کنارے اور تھر کے ریگستان کے درمیان واقع ہے نرم مٹی کا ایک ہموار سیلابی میدان ہے۔ یہاں نہروں کا جال بچھا ہوا ہے اور افزائش پیداوار کے اعتبار سے سندھ کے زیریں میدان کا اہم ترین حصہ ہے۔ مشرق میں ریگستانی علاقے میں مدغم ہو جاتا ہے۔ دریائے سندھ کے مغرب کی طرف کو کھیر تھر کا اونچا دامنی میدان ہے جو دریا کی طرف آہستہ آہستہ ڈھلتا چلا گیا ہے۔ اسی کو بے شمار پہاڑی نالے عبور کرتے ہیں۔

جنوب میں پرانا ڈیلٹائی علاقہ کوٹڑی بیراج کی نہروں سے آباد کیا جا رہا ہے۔ سکھر بیراج، کوٹڑی بیراج اور گڈو بیراج سے نکلنے والی نہریں جن علاقوں میں بہتی ہیں۔ وہاں بڑی شادابی اور خوشحالی آ گئی ہے۔

6۔ بلوچستان پلیٹو :

یہ پلیٹو قریباً 600 میٹر سے 900 میٹر تک بلند ہے۔ کوہ کھیر تھر کے مغرب میں واقع ہے خشک پہاڑیاں پلیٹو پر شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ شمال میں ٹوبہ کاکٹر اور چاغی کے پہاڑی سلسلے اس کو افغانستان سے جدا کرتے ہیں۔ وسطی براہی اور مکرانی سلسلے اس کے وسط میں واقع ہیں۔ اور مکران کے ساحلی پہاڑ پلیٹو کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ شمال مغرب میں ایک بڑا رقبہ ریگستان ہے۔ یہاں ایک نمکین پانی کی جھیل ہے۔ جس کو 'ہامون مشخیل' کہتے ہیں۔ اس میں کئی چھوٹے چھوٹے دریا گرتے ہیں۔ یہاں صرف چند دریا قابل ذکر ہیں۔ دریائے ژوب شمال کی طرف بہتا ہوا دریائے گومل سے جا ملتا ہے۔ کراچی کے مغرب میں دریائے حب اور مکران کے دریاؤں میں ہیرالی اور ہنگول دشت خاص طور پر قابل ذکر

ہیں جو بحیرۂ عرب میں گرتے ہیں ۔

بارش کی قلت کی وجہ سے بیشتر علاقے خشک ہیں اور کہیں کہیں پہاڑی ڈھلانوں پر واقع قدرتی چراگاہوں پر بھیڑیں اور بکریاں پالی جاتی ہیں ۔ البتہ کوئٹہ اور چمن کے علاقوں میں کاریز کے ذریعے تھوڑی بہت آبپاشی ہوتی ہے ۔ بلوچستان پلیٹو معدنی اعتبار سے بہت اہم ہے جہاں سے قدرتی گیس ، کوئلہ ، سیسہ ، کرومیم ، تانبا اور قیمتی پتھر نکلتے ہیں ۔

پاکستان کی آب و ہوا :

پاکستان کی آب و ہوا شدید بری قسم کی ہے موسم گرما اور موسم سرما میں بہت زیادہ تفاوت پایا جاتا ہے ۔ عموماً آب و ہوا کا انحصار اس ملک کے عرض بلد یعنی وہاں پر سورج کی شعاعوں کے رخ یا ان کی تمازت پر منحصر ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ دیگر عوامل یعنی ہوا کا دباؤ پہاڑوں کے رخ ، ہواؤں کی سمت ، سمندر سے دوری اس پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔

پاکستان کے دو موسم اہم ہیں موسم گرما جو مئی سے ستمبر تک ہوتا ہے ۔ موسم سرما جو نومبر سے فروری تک ہوتا ہے مارچ اپریل اور ستمبر اکتوبر میں نہ زیادہ گرمی ہوتی ہے نہ زیادہ سردی ۔ مارچ اپریل کے موسم کو ہم بہار کا نام دیتے ہیں اور ستمبر اکتوبر کے موسم کو موسم خزاں کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔

پاکستان کو ہم آب و ہوا کے لحاظ سے مندرجہ ذیل چار خطوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔

1۔ سرد آب و ہوا کا شمال اور شمال مغربی پہاڑی خطہ :

اس خطے میں پاکستان کا تمام شمالی پہاڑی اور شمال مغربی پہاڑی علاقے شامل ہیں ۔ یہاں پر موسم سرما انتہائی سرد ہوتا ہے ۔ زیادہ تر اس موسم میں برف باری تقریباً 2000 میٹر سے بلند علاقوں پر ہوتی ہے لیکن وادیاں انتہائی خشک رہتی ہیں ۔ انھی دنوں میں بحیرۂ روم کے مغربی گرد باد (سائیکلون) پاکستان کے مغربی

علاقوں تک پہنچ جاتے ہیں - یہ نہ صرف شمالی علاقوں میں بارش برساتے ہیں - بلکہ کثیر تعداد میں شمالی پہاڑوں پر برف باری کا بھی سبب بنتے ہیں - خاص طور پر صوبہ سرحد شمالی بلوچستان اور شمالی پنجاب میں مغرب سے آنے والے گرد باد (سائیکلون) کی وجہ سے 100 ملی میٹر سے لے کر 250 ملی میٹر تک بارش ہوتی ہے -

اونچے پہاڑوں پر اس موسم میں خاص برف باری ہوتی ہے جو چھوٹے بڑے گلیشروں کی صورت اختیار کر لیتی ہے - گرمیوں میں گلیشروں سے رفتہ رفتہ برف پگھل کر جو پانی حاصل ہوتا ہے ہمارے دریاؤں اور نہروں میں آتا ہے - جنوری اور فروری کے مہینوں میں شمالی پہاڑی علاقوں میں جہاں ان کی بلندی 6000 میٹر سے زیادہ ہوتی ہے- وہاں درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی گر جاتا ہے -

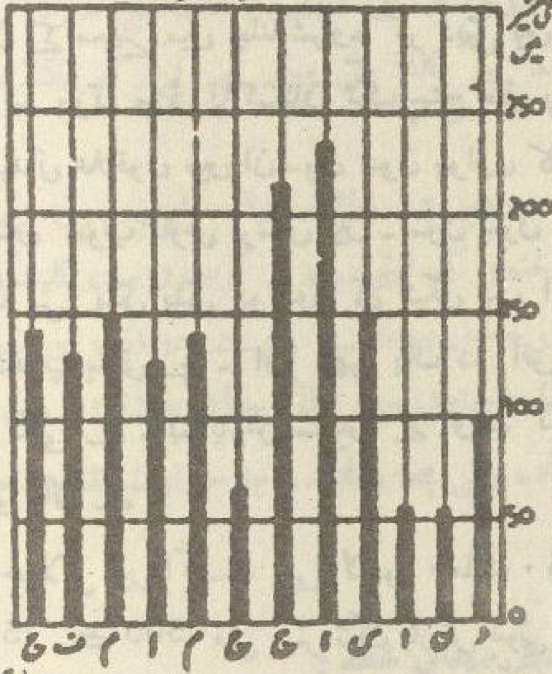
2۔ شدید آب و ہوا کا شمالی میدانی خطہ :

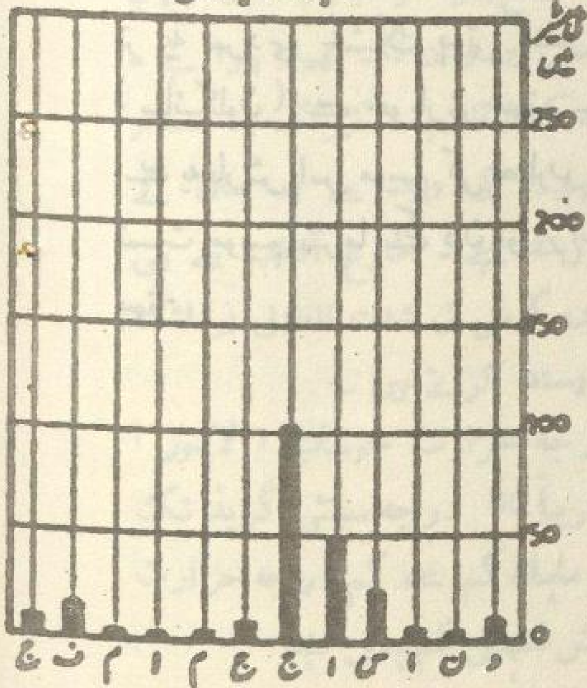
یہ خطہ شمالی پہاڑی علاقوں کے دامن سے شروع ہو کر جنوب میں جہاں دریائے سندھ کے سارے معاون دریا آپس میں ملتے ہیں وہاں تک پھیلا ہوا ہے - موسمی لحاظ سے انتہائی شدید آب و ہوا کا خطہ کہلاتا ہے - کیونکہ یہ سمندر سے کافی دور اور سورج کی تمازت کے زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ سال کے 60 فیصد اوقات میں گرمی کی لپیٹ میں ہی رہتا ہے - طلوع آفتاب سے ہی خصوصاً مئی ، جون اور جولائی کے مہینوں میں گرمی کی شدت ناقابل برداشت ہو جاتی ہے - لوگ اکثر گھروں ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں -

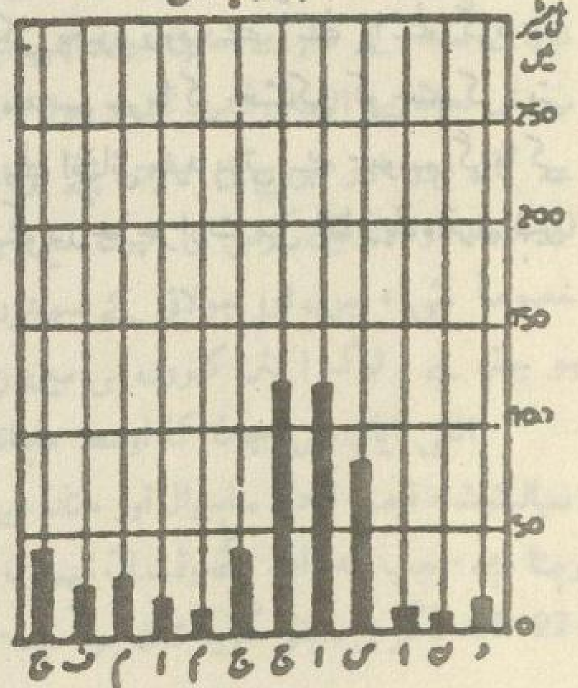
انھی ایام میں جون کا اوسط ماہانہ درجہ حرارت خوشاب ، لاہور ، سیالکوٹ ، فیصل آباد ، ساہیوال اور ملتان میں تقریباً 43 درجہ سینٹی گریڈ تک رہتا ہے - جب کہ رات کے وقت ان شہروں میں ماہانہ کم سے کم درجہ حرارت 27-29 ڈگری سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے - بارش انتہائی کم ہوتی ہے -

انھی دنوں میں وسط ایشیا میں کم ہوا کے دباؤ کا ایک بہت بڑا علاقہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ جو بحر ہند سے ہواؤں کو اپنی جانب کھینچنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ موسم گرما کی مون سون ہوائیں ہیں جو براعظم ہند و پاک کی جانب قریباً جون کے مہینے میں چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ اور جولائی کے مہینے میں بنگلہ دیش سے ہوتی ہوئی پاکستان تک پہنچ جاتی ہیں۔ بہر حال 15 جولائی تک ملک کے میدانی علاقوں میں ان مون سون ہواؤں کا اثر پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ اس علاقے میں خوب بارش برساتی ہیں۔ مون سون بارش نہ تو موسلا دھار ہوتی ہے اور نہ ہی ہلکی ہلکی بوندوں کی شکل میں اکثر اوقات تین سے چار دن تک سخت دھوپ ہوتی ہے۔ اور پھر یک دم افق پر بادل چھا جاتے ہیں اور بارش ہونے لگتی ہے۔ یہ بارش ستمبر کے وسط تک جاری رہتی ہے اور پھر قریباً ختم ہو جاتی ہے۔

جون، جولائی اور اگست میں لاہور، ملتان، فیصل آباد، خوشاب اور سیالکوٹ میں 150 سے 500 ملی میٹر تک بارش ہوتی ہے۔ ستمبر میں بارش کی شدت میں کافی کمی ہو جاتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ برسات کا موسم اپنی شدت کھو بیٹھتا ہے۔ موسم سرما میں ان علاقوں میں کافی سردی پڑتی ہے زیادہ تر یہ سردی خشک ہوتی ہے۔ لیکن بحیرہ روم سے آنے والے گرد باد (سائیکلون) سے جو بارش ہوتی ہے وہ موسم سرما کی خشکی کو ختم کر دیتی ہے یہ بارش اس موسم کی فصلوں کے لیے انتہائی مفید ہوتی ہے۔ موسم گرما کی نسبت موسم سرما کے دن اور رات کے درجہ حرارت میں اتنا زیادہ فرق نہیں ہوتا۔


مری
ماہوار بارش
ملی میٹر میں
250
200
150
100
50
0
ج ف م ا م ج ج ا س ا ن د


کراچی
ماہوار بارش
ملی میٹر میں
250
200
150
100
50
0
ج ف م ا م ج ج ا س ا ن د


لاہور
ماہوار بارش
ملی میٹر میں
250
200
150
100
50
0
ج ف م ا م ج ج ا س ا ن د

3۔ زیریں وادئ سندھ اور ریگستان تھر کا خطہ :

شمال میں مٹھن کوٹ کے مقام پر جہاں دریائے سندھ اکیلا سمندر کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے، زیریں وادی سندھ کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سبی، کوہ کھیر تھر کے دامن کا میدانی علاقہ اور ریگستان تھر میں بھی اسی قسم کی آب و ہوا ملتی ہے۔ یہاں ساحل کے قریب ہوا میں کچھ نمی رہتی ہے۔ جب کہ ساحل سے 120 کلومیٹر دور کے علاقوں میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ جس کا اندازہ سبی کے درجہ حرارت سے کیا جاسکتا ہے۔ یہاں عموماً گرمیوں میں اوسط ماہانہ درجہ حرارت 45 درجہ سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ ہوا میں نمی کم ہونے کی وجہ سے گرمی کی تمازت برداشت سے باہر ہوتی ہے۔ جب کہ تھر کے علاقے میں نسیم بری اور نسیم بحری کی وجہ سے گرمی کی شدت کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

4۔ بری آب و ہوا کا سطح مرتفع بلوچستان کا خطہ :

سارے علاقے میں سوائے اونچے اونچے پہاڑوں کے موسم گرما میں درجہ حرارت اوسط 38 سے 40 درجہ سینٹی گریڈ کے قریب رہتا ہے۔ اونچے پہاڑی علاقوں میں جن میں کوئٹہ، زیارت اور فورٹ سنڈیمن شامل ہیں۔ درجہ حرات گرمیوں میں 30 سے 32 درجہ سینٹی گریڈ تک رہتا ہے۔ گرمی زیادہ ہونے کی وجہ سے ہوائی رطوبت تقریباً 40 سے 50 فیصد رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے گرمی کی شدت کا احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

ساحلی علاقوں میں سمندر کے نزدیکی کی وجہ سے درجہ حرارت میں خاصی کمی رہتی ہے۔ جب کہ پسنی، گوادر، جیوانی، گڈانی، سون میانی کے علاقوں میں 30 سے 32 درجہ تک اوسط ماہانہ درجہ حرارت ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ باوجود بحیرۂ عرب کے نزدیک ہونے کے اس علاقے میں سون سون ہواؤں کو ایک محاذ کی صورت میں بلوچستان پر سے گزرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لہٰذا برسات کے دنوں میں بھی بہت کم بارش یعنی 20 سے 25 ملی میٹر تک ہوتی ہے۔ اس

وجہ سے پورے بلوچستان میں شاید ہی کوئی دریا ہو جو سمندر تک پہنچ سکتا ہو- کبھی کبھار 10 ، 15 یا 50 سال کے عرصہ میں اس موسم میں شدید قسم کی موسلا دھار بارش سیلاب کی سی صورت اختیار کرلیتی ہے -

سردیوں میں بلوچستان کی آب و ہوا عموماً انتہائی خوشگوار رہتی ہے - درجہ حرارت اوسطاً 10 سے 15 ڈگری سینٹی گریڈ تک رہتا ہے - اسی موسم میں مغرب کی طرف سے آنے والے گرد باد (سائیکلون) بارش برساتے ہیں- یہ بارش سال کی قریباً 80 فیصد کے برابر ہوتی ہے - پہاڑی علاقوں میں سردیوں میں برف باری ہوتی ہے - بارش 300 ملی میٹر سے زائد ریکارڈ کی گئی ہے - اس موسم میں کوئٹہ کا درجہ حرارت منفی 3 درجے سینٹی گریڈ تک چلا جاتا ہے - جب کہ کم بلند علاقوں میں کم سے کم ماہانہ درجہ حرارت 4 سے 5 ڈگری سینٹی گریڈ تک رہتا ہے - ساحلی علاقوں میں سردیوں کا موسم مزید خوشگوار رہتا ہے اور درجہ حرارت 8 سے 10 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے -

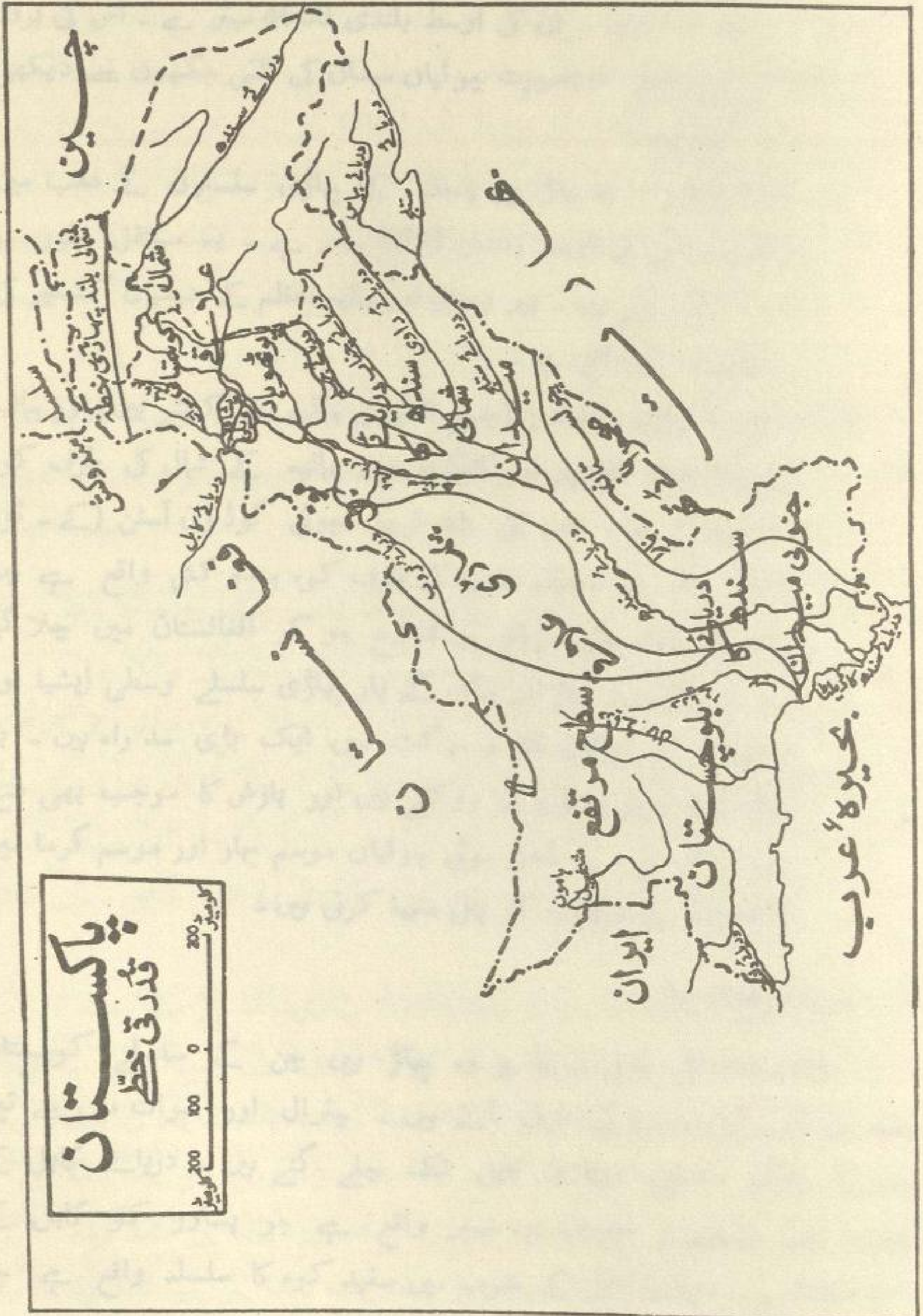
پاکستان کے قدرتی خطے :

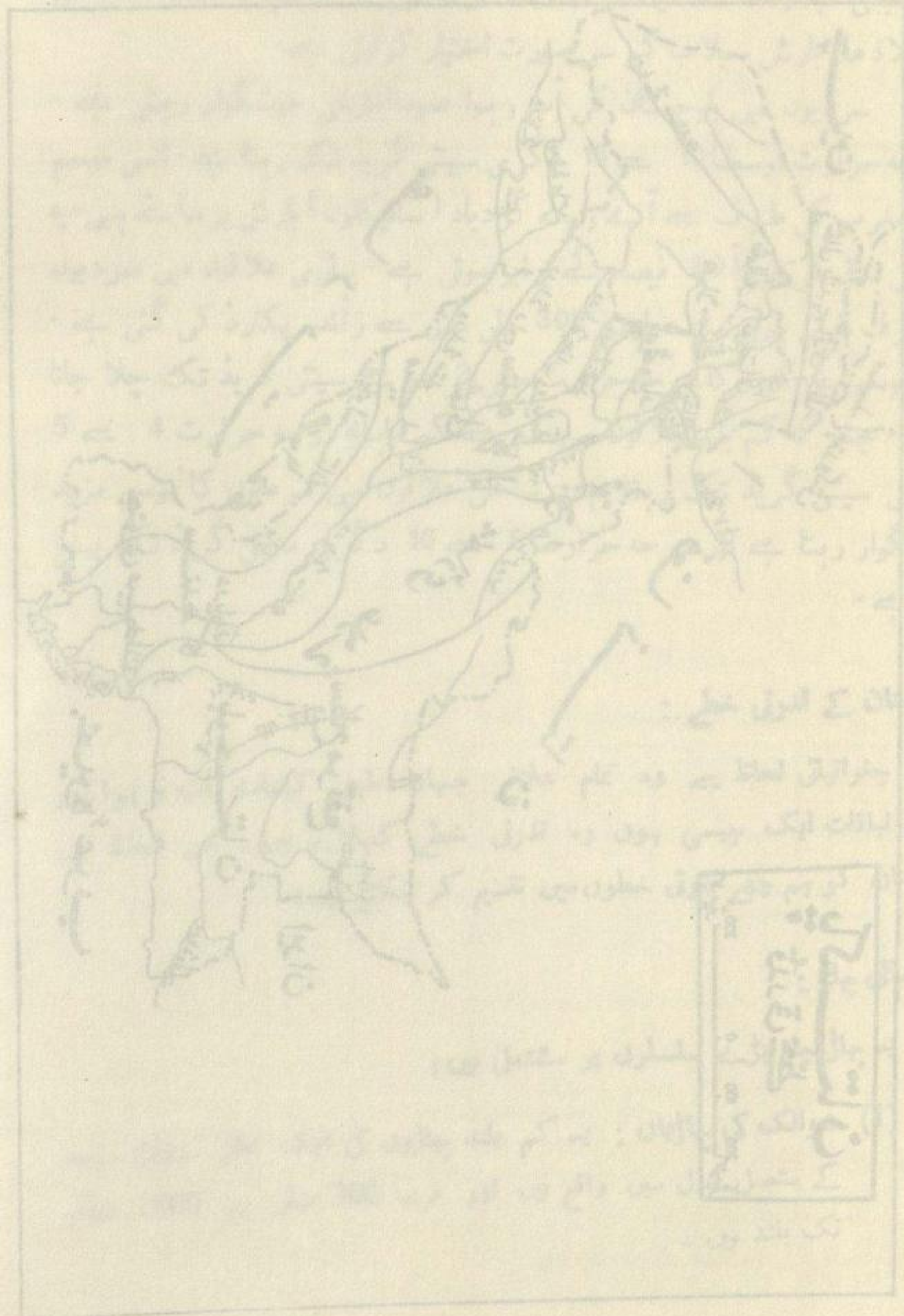
جغرافیائی لحاظ سے وہ تمام علاقے جہاں طبعی کیفیات آب و ہوا اور قدرتی نباتات ایک جیسی ہوں وہ قدرتی خطے کہلاتے ہیں ۔ اس لحاظ سے پاکستان کو ہم چھے قدرتی خطوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1۔ شمالی پہاڑ :

یہ پہاڑ چار بڑے سلسلوں پر مشتمل ہیں :

(1) **شوالک کی پہاڑیاں :** یہ کم بلند پہاڑوں کی ایک قطار میدان سندھ کے متصل شمال میں واقع ہیں اور قریباً 300 میٹر سے 1000 میٹر تک بلند ہیں ۔


پاکستان
قدرتی خطے
چین
ایران
بحیرۂ عرب



(2) پیر پنجال کے پہاڑی سلسلے : یہ پہاڑ شمال کی طرف شوالک کے متوازی واقع ہیں - اِن کی اوسط بلندی 4600 میٹر ہے - اس کی برف سے ڈھکی ہوئی خوبصورت چوٹیاں میدان کی کئی جگہوں سے دیکھی جا سکتی ہیں -

(3) ہمالیہ اعظم : یہ پہاڑ پیر پنجال کے پہاڑی سلسلوں کے عقب میں واقع ہیں جن کی اوسط بلندی 6500 میٹر ہے - یہ مستقل طور پر برف پوش رہتے ہیں - پیر پنجال اور ہمالیہ اعظم کے درمیان کشمیر کی مشہور وادی واقع ہے -

(4) لداخ کا پہاڑی سلسلہ : (جسے اندرونی ہمالیہ بھی کہتے ہیں) اور ہمالیہ کے پہاڑ شمالی کشمیر اور گلگت میں ہمالیہ کے شمال کی طرف کوہ قراقرم واقع ہے - اس کی بلند ترین چوٹی گوڈ ون آسٹن (کے - ٹو) 8611 میٹر ہے - شمال مغرب کی طرف کوہ ہندو کش واقع ہے جو پامیر کی بلند سطح مرتفع سے شروع ہو کر افغانستان میں چلا گیا ہے - ہمالیہ کے پہاڑ اور ہمالیہ کے ہار پہاڑی سلسلے وسطی ایشیا اور پاکستان کے درمیان نقل و حرکت میں ایک بڑی سد راہ ہیں - یہ پہاڑ مون سون ہواؤں کو روکتے ہیں اور بارش کا موجب بھی بنتے ہیں ان کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں موسم بہار اور موسم گرما میں پاکستان کے دریاؤں کو پانی مہیا کرتی ہیں -

2۔ مغربی سرحدی پہاڑ :

میدان سندھ کی مغربی سرحد پر وہ پہاڑ ہیں جن کے سلسلے کوہستان ہمالیہ سے نکل کر جنوب کی طرف آتے ہیں - چترال اور سوات میں سے تین چھوٹے پہاڑی سلسلے دریائے کابل تک چلے گئے ہیں - دریائے کابل کے جنوب میں مشہور و معروف درہ خیبر واقع ہے جو پشاور کو کابل کے ساتھ ملاتا ہے - دریائے کابل کے جنوب میں سفید کوہ کا سلسلہ واقع ہے جو

شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے۔ اوسط بلندی 3600 میٹر ہے۔ کوہ سفید کے جنوب میں وزیرستان کی پہاڑیاں واقع ہیں۔ دریائے گومل سے جنوب کی طرف کوہ سلیمان قریباً 500 کلومیٹر کے فاصلے تک جنوب مغربی سمت میں پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس کی بڑی چوٹی تخت سلیمان 3,500 میٹر اونچی ہے۔ کوہ سلیمان کے جنوبی سرے میں مری اور بگٹی کی پہاڑیاں ہیں۔ اس علاقے میں مشہور درہ بولان واقع ہے۔ اس کے انتہائی شمالی سرے پر کوئٹہ آباد ہے۔ سندھ کے زیریں میدان کی مغربی سرحد پر کوہ کیرتھر واقع ہے۔

مغربی پہاڑ کئی متوازی سلسلوں پر مشتمل ہیں اور کوہ ہمالیہ کے مقابلے میں بہت کم بلند ہیں۔ یہاں بارش کم ہوتی ہے اور نباتات کا نام و نشان تک نہیں لیکن کبھی کبھار سخت بارش سے ندیوں اور نالوں میں تباہ کن سیلاب آ جاتا ہے۔

3۔ کوہ نمک اور سطح مرتفع پوٹھوہار:

کوہ نمک کے سلسلے دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر جوگی ٹلا اور بکڑیالا کی پہاڑیوں سے شروع ہوتے ہیں اور دریا کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد مغرب کو مڑ کر ضلع بنوں سے ہوتے ہوئے کوہ سلیمان سے مل جاتے ہیں۔ کالا باغ کے قریب دریائے سندھ ان پہاڑوں کو کاٹ کر اپنا راستہ بناتا ہے۔ یہاں دریا کی چوڑائی کم ہو جاتی ہے۔

کوہ نمک کے سلسلوں کی اوسط بلندی قریباً 700 میٹر ہے۔ البتہ ضلع خوشاب میں سکیسر کے قریب ان کی بلندی 1,500 میٹر تک چلی گئی ہے۔ اس بلندی کی بدولت سکیسر میں گرمیوں کا موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ ویسے تو کوہ نمک بنجر پہاڑ ہیں لیکن معدنی دولت سے مالا مال ہیں۔

کوہ نمک کے شمال میں سطح مرتفع پوٹھوہار واقع ہے۔ اس سطح مرتفع کی بلندی 300 میٹر سے 600 میٹر تک ہے۔ اس علاقے میں بہنے والے ندی نالوں

نے زمین میں بہت سے کٹاؤ پیدا کر دیے ہیں۔ ڈھلانوں سے زرخیز مٹی بہہ گئی ہے اور اندر سے بنجر چٹانیں نظر آنے لگی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں جہاں ارد گرد کی مٹی جمع ہو گئی ہے پیالی نما نشیبی مقامات نظر آتے ہیں۔ ان جگہوں پر کھیتی باڑی ہوتی ہے۔

سطح مرتفع پوٹھوہار میں دو اہم دریا مشرق سے مغرب کی طرف بہتے ہیں۔ ان میں سے بڑا دریائے سوان ہے جس کی وادی قدیم تہذیب کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ دریائے ہرو بھی دریائے سوان کی طرح مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہوا دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔

4۔ دریائے سندھ کے میدانی خطے:

اس خطہ میں دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا جہلم، چناب، راوی اور ستلج بہتے ہیں۔

اچھے نہری نظام کی وجہ سے دریائے سندھ کے میدانی علاقے دنیا بھر میں اپنی آبپاشی اور زرعی پیداوار کے لیے مشہور ہیں۔ یہاں نہروں، ریلوے اور سڑکوں کے جال بچھا دیے گئے ہیں اور ایک نیم صحرائی علاقے کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب بھی کچھ نیم صحرائی علاقے باقی رہ گئے ہیں جہاں نظام آبپاشی ابھی تک مہیا نہیں کیا گیا جن میں تھر اور چولستان کے علاقے شامل ہیں۔ یہاں نہریں، سڑکیں اور ریل کے کم ہونے کی وجہ سے یہ علاقے نسبتاً کم ترقی یافتہ ہیں۔

آبپاشی نے جہاں زراعت کو ترقی دی ہے وہاں زراعت کے لیے کچھ مسائل بھی پیدا کر دیے ہیں۔ مثلاً سیم و تھور کا مسئلہ جو بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ یہاں کے نظام آبپاشی کی ہی پیداوار ہے۔ واپڈا کی بر وقت توجہ سے سیم زدہ علاقوں کو دوبارہ قابل کاشت بنایا جا رہا ہے۔ پاکستان میں بڑے بڑے صنعتی شہروں، اجناس کی منڈیوں، ریلوے، سڑکوں، یونیورسٹیوں، سکول، کالج اور اسپتالوں کی موجودگی اور پینے کے پانی کی فراہمی کی وجہ سے

اس علاقے نے خاصی ترقی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ علاقہ پاکستان میں آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ گنجان آباد اور ترقی یافتہ علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں شہری ترقی۔ صنعتی ترقی، تعلیمی اور زرعی ترقی کے بے شمار اعلیٰ ادارے قائم ہو چکے ہیں۔

شمالی میدانوں کی نسبت جنوبی سندھ کے دریائی میدانوں میں خشک سالی بارش کی کمی اور عمل تبخیر کے زیادہ ہونے کی وجہ سے نیم صحرائی صورت پائی جاتی ہے۔ نہری نظام اس علاقہ میں کم ہے۔ اور جہاں جہاں نہریں موجود ہیں وہ علاقے بھی سیم و تھور کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہاں شمالی میدانوں کی طرح سیم کو ختم کرنے کے لیے جگہ جگہ ٹیوب ویل نہیں لگائے جا سکے۔ جس کی وجہ سے زیر زمین پانی میں نمکیات کی بہتات ہے اگر زیادہ نمک والا پانی کاشت کے لیے استعمال میں لایا جائے تو ساری کی ساری مٹی تھور یا نمکیات سے بھر کر ہمیشہ کے لیے بنجر بن جاتی ہے۔ لہذا اس علاقہ میں گہری گہری نہریں کھودی گئی ہیں۔ جو کہ زیر زمین پانی کو لے کر دریائے سندھ میں ڈالتی ہیں اور اس طرح نمکین پانی کا نکاس سمندر میں ہو جاتا ہے۔ زرعی اعتبار سے یہ علاقہ کپاس، مرچ، گندم اور کیلے وغیرہ کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ صنعتی و تجارتی لحاظ سے حیدر آباد اور کراچی کے علاقے ملک کے نہایت ہی ترقی یافتہ علاقوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

5۔ **سطح مرتفع بلوچستان کا خطہ:**

سطح مرتفع بلوچستان ایک وسیع علاقہ ہے۔ پہاڑی، نیم پہاڑی ڈھلوانوں، وادیوں اور میدانوں پر مشتمل ہے۔ یہ پاکستان کے انتہائی خشک علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ بارش بہت کم ہوتی ہے۔ پانی کی کثیر مقدار عمل تبخیر سے ضائع ہو جاتی ہے۔ یہاں کی اوسطاً بارش 150 ملی میٹر سے 200 ملی میٹر ہے۔ پانی کی کمی اس کی ترقی کی رفتار میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آبی وسائل، ذرائع آمد و رفت کی کمی اور معدنیات کی پیداوار میں مشکلات کی وجہ سے۔ اس علاقے کی ترقی سست ہے۔ حالانکہ بلوچستان میں تانبے، کوئلے،

کرومائٹ میگنا سائٹ گیس وغیرہ کے وسیع ذخائر موجود ہیں ۔ لیکن کان کنی کے قدیم طریقے عمل میں لانے کی وجہ سے معدنی پیداوار سالہا سال سے ایک جیسی چلتی آ رہی ہے ۔

زیر زمین پانی اور معدنی وسائل کا اچھی طرح سے جائزہ لیا جا رہا ہے ۔ جب کہ محکمہ ارضیاتی سروے ۔ واپڈا ، محکمہ آبپاشی پوری محنت کے ساتھ اس علاقے کو ترقی دینے میں دلچسپی رکھتے ہیں ۔ اور حکومت پاکستان کے دیگر بے شمار محکمے اس علاقے کی ترقی کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں ۔ گیس کی پائپ لائن ، نئی سڑکیں نئے ایر پورٹ ۔ نئے وسائل کاشت کے طریقے ، بنیادی صحت کی سہولتیں ۔ اسکول، کالج اور مدرسے مہیا کیے جا رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ حکومت نے بلوچستان میں صنعت لگانے والوں کو بے شمار مراعات بھی دے رکھی ہیں ۔ مچھلی پکڑنے کے ٹرالر مچھلی بندرگاہیں وغیرہ تیز رفتاری سے بنائی جا رہی ہیں ۔ کراچی کے ساتھ ہی بلوچستان کی حد پر ایک بہت بڑا صنعتی علاقہ تیار ہوا ہے جس میں کئی اقسام کی صنعتیں کارخانے لگائے جا چکے ہیں ان میں پاکستان اسٹیل مل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ حب ڈیم کی وجہ سے بجلی کی فراہمی سے اس علاقے نے اب خاصی ترقی کرنی شروع کر دی ہے ۔

6۔ تھر اور تھل کے ریگستانی و نیم ریگستانی علاقے :

رن کچھ کے دلدلی علاقے کے شمال میں ہندوستان کی سرحد اور نارا نہر کے درمیانی علاقے کو تھر کا ریگستان کہتے ہیں ۔ یہاں کی سطح سندھ کے میدانوں سے تقریباً 60 میٹر اونچی ہے ۔ سارے کا سارا ریگستان ہوا کے عمل سے طولانی بارخانی اور سطحی ٹیلوں پر مشتمل ہے ۔ جس میں درختوں کا مکمل فقدان ہے کہیں کہیں زیریں علاقوں میں خشک گھاس اور صحرائی پودے نظر آتے ہیں ہوا کے چلنے کے ساتھ سارے علاقے میں ریت عموماً اڑتی رہتی ہے ۔ یہاں کے رہنے والے اپنے گھروں کو پکے ٹیلوں کے اوپر بناتے ہیں ۔ اکثر گھر مخروطی شکل کے ہوتے ہیں جن پر گھاس پھوس کی چھت ڈالی جاتی ہے ۔ ایسے مکانوں

کی تخلیق غالباً یہاں کے لوگوں نے ریت کے حملے سے بچنے کے لیے اور گھروں کو ہوادار بنانے کے لیے کی ہے۔ یہاں کے لوگ مکئی اور تیل کے بیجوں کی کاشت سے کافی فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ جب کبھی زیادہ بارش ہو جائے تو یہ علاقہ کچھ عرصہ کے لیے سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ یہاں اوسطاً بارش 125 ملی میٹر سالانہ سے کم ہوتی ہے۔

قدرتی وسائل کے کم ہونے کی وجہ ہے یا پھر ان کی دریافت نامکمل ہونے کی وجہ سے شاید یہ علاقہ کافی عرصہ تک ریگستان ہی رہے۔ یہاں پاکستان کے بہترین مویشی جن میں عمدہ قسم کے گائے، بیل اور اونٹ شامل ہیں ہزاروں کی تعداد میں پالے جاتے ہیں اور قریباً کافی تعداد میں روزانہ حیدر آباد اور کراچی میں گوشت اور دودھ فراہم کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔

دریائے جہلم کے مغرب میں ریتلا علاقہ ہے جسے "تھل" کہتے ہیں۔ جناح بیراج سے نکالی جانے والی نہروں کی بدولت اب اس علاقے کی ریگستان کی سی کیفیت نہیں رہی ہے۔

پاکستان کا انتظامی ڈھانچہ:

پاکستان ایک وفاقی مملکت ہے اور آئین کی رو سے اختیارات صوبوں اور مرکز میں منقسم ہیں۔ وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتیں اپنے اپنے آئینی اختیارات کے مطابق کام کرتی ہیں۔ پاکستان کے آئین کا اطلاق درج ذیل علاقوں پر ہے:

(الف) صوبہ بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ، صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ۔

(ب) دارالحکومت اسلام آباد کا علاقہ۔

(ج) مرکز کے تحت قبائلی علاقے۔

(د) دیگر ایسے علاقے اور ریاستیں جو پاکستان میں شامل ہیں یا آئندہ شامل ہو جائیں۔

ملک کا سربراہ صدر ہے۔ انتظامی امور کی بجا آوری کے سلسلے میں وزیر اعظم کی مدد کے لیے وفاقی وزرا مقرر کیے جاتے ہیں ۔ ہر وفاقی وزیر کے ذمے ایک یا ایک سے زیادہ محکمے ہوتے ہیں جن کی کارکردگی کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے ۔ قومی سطح پر قانون سازی کے لیے مجلس شوریٰ قائم ہے جو قومی اسمبلی اور سینٹ پر مشتمل ہے ۔ اس کے علاوہ مستقل سرکاری عملہ ہوتا ہے جو حکومتی پالیسیوں پر عملدرآمد کرواتا ہے ۔ ہر شعبے کا ایک سیکرٹری ہوتا ہے جو اس کا سربراہ ہوتا ہے ۔ اس کی اعانت کے لیے سینکڑوں چھوٹے بڑے افسران و دیگر عملہ ہوتا ہے ۔ اہم شعبے درج ذیل ہیں :

1۔ محکمہ امورِ خارجہ ۔
2۔ محکمہ دفاع ۔
3۔ محکمہ امورِ داخلہ ۔
4۔ محکمہ مالیات ۔
5۔ محکمہ تعلیم ۔
6۔ محکمہ قانون ۔
7۔ محکمہ صحتِ عامہ ۔
8۔ محکمہ صنعت و زراعت ۔
9۔ محکمہ مواصلات ۔
10۔ محکمہ رفاہ عامہ ۔

ہر صوبے کا سربراہ گورنر ہوتا ہے ۔ انتظامی امور کی بجا آوری کے سلسلے میں وزیر اعلیٰ کی مدد کے لیے صوبائی وزرا مقرر کیے جاتے ہیں ۔ ہر صوبائی وزیر کے ذمے ایک یا ایک سے زیادہ محکمے ہوتے ہیں جن کی کارکردگی کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے ۔ صوبائی سطح پر قانون سازی کے لیے صوبائی اسمبلی قائم ہے ۔ ہر صوبے میں ایک سول سیکرٹریٹ ہوتا ہے جس کا سربراہ چیف سیکرٹری ہوتا ہے جو وزیر اعلیٰ

کی ہدایت کے مطابق صوبے کا نظم و نسق چلاتا ہے۔ اس کے ماتحت صوبائی محکموں کے سربراہ ہوتے ہیں جن کو سیکرٹری کہا جاتا ہے۔ صوبائی امور کے متعلق اہم سیکرٹری یہ ہیں۔

1۔ سیکرٹری داخلہ: یہ امن عامہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت انسپکٹر جنرل پولیس ہوتا ہے جو محکمہ پولیس کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے۔ انسپکٹر جنرل پولیس کے ماتحت ڈویژنل سطح پر ڈی۔ آئی۔ جی اور ضلع کی سطح پر سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوتے ہیں۔ جیلوں کا محکمہ بھی صوبائی محکمہ داخلہ کے ماتحت ہے۔

2۔ سیکرٹری تعلیم: محکمہ تعلیم کا اعلیٰ افسر ہے۔ اس کے ماتحت ڈائریکٹر پبلک انسڑکشن (کالجز) اور ڈائریکٹر پبلک انسڑکشن (اسکولز) ہوتے ہیں۔ ڈویژنل سطح پر ڈائریکٹر کالجز و اسکول اور ضلعی سطح پر اسکولوں کے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر ہوتے ہیں۔

3۔ سیکرٹری خزانہ: صوبائی آمدنی و اخراجات کا نگران اعلیٰ ہے۔

4۔ سیکرٹری صحت: محکمہ صحت کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ اور ڈویژنل سطح پر ڈائریکٹر ہیلتھ اور ضلعی سطح پر ڈسٹرکٹ ہیلتھ افیسر ہوتے ہیں۔

5۔ سیکرٹری لوکل گورنمنٹ تمام مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں کا نگران اعلیٰ ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ سیکرٹری زراعت، پرورش حیوانات و ماہی گیری، سیکرٹری ہاؤسنگ و فزیکل پلاننگ، سیکرٹری اطلاعات، سیکرٹری سروسز اینڈ جنرل انتظامیہ، سیکرٹری ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن، سیکرٹری زکواۃ و اوقاف وغیرہ ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک منصوبہ بندی کمیشن ہوتا ہے اس کا سربراہ چئرمین پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ کہلاتا ہے۔ یہ ترقیاتی منصوبے بناتا ہے۔

مقامی حکومت کے ادارے :

ڈسٹرکٹ کونسل : ہر ضلع میں مقامی حکومت کا سب سے بڑا ادارہ ڈسٹرکٹ کونسل ہوتا ہے جس کے اراکین منتخب ہوتے ہیں ۔ اپنے ذرائع سے ضلع کی ترقی کے کام کرنے کے علاوہ ڈسٹرکٹ کونسل حکومت کو بھی متعلقہ ضلع کے متعلق ترقیاتی پروگراموں کے سلسلے میں مشورے دیتی ہے ۔

میونسپل کارپوریشن : بہت بڑے شہروں میں میونسپل کارپوریشن ہوتی ہے یہ شہر میں ترقیاتی کام کرتی ہے اور تعلیم و صحت اور صفائی کے امور سرانجام دیتی ہے ۔

میونسپل کمیٹی و یونین کونسل : شہر میں میونسپل کمیٹی ، قصبہ میں ٹاون کمیٹی اور دیہات میں یونین کونسل ہوتی ہے ۔ یہ سب منتخب ادارے ہوتے ہیں ۔

عدالتی نظام : وفاقی سطح پر سپریم کورٹ ہے جو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت ہے ۔ ہر صوبے میں ایک ہائی کورٹ ہے ، جس کے ماتحت ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہوتا ہے ۔ اس کے ماتحت سول جج اور مجسٹریٹ ہوتے ہیں جو انصاف بہم پہنچاتے ہیں ۔

ڈویژنل نظام : ہر صوبہ مختلف ڈویژنوں میں منقسم ہے ۔ ہر ڈویژن کا سربراہ کمشنر ہوتا ہے ، جس کے ماتحت ڈپٹی کمشنر ہوتے ہیں ۔ ڈپٹی کمشنر اپنے ضلع کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے ۔ تحصیل کی سطح پر اسسٹنٹ کمشنر و مجسٹریٹ ہوتے ہیں جو نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے ہیں ۔ ان کے پاس عدالتی اختیارات بھی ہوتے ہیں ۔

چاروں صوبوں میں ایک جیسا نظام رائج ہے ۔

ماسوائے قبائلی علاقوں کے جہاں وفاقی حکومت ، گورنمنٹ کے ایجنٹ کے ذریعے قبائلی سرداروں سے رابطہ رکھ کر ان علاقوں کا نظم و نسق چلاتی ہے ،

سارے کا سارا قبائلی علاقہ جرگہ کے انصاف کے تحت آتا ہے یعنی انصاف جرگہ کے ذریعہ ہو جاتا ہے۔ یہ جرگہ اس قبیلے کے مذہبی اور بااصول لوگوں کی ایک کونسل پر مشتمل ہوتا ہے۔ جرگے کا فیصلہ اس قبیلے کے ہر شخص پر لاگو ہوتا ہے۔

سوالات

1۔ پاکستان کے محل وقوع اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

2۔ پاکستان کے شمالی پہاڑی اور مغربی پہاڑی علاقہ کا تقابلی جائزہ پیش کریں۔

3۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیں۔

پوٹھوہار پلیٹو۔ بلوچستان پلیٹو۔ شمالی پہاڑوں کی افادیت۔

4۔ پاکستان کی آب و ہوا کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہیں بیان کریں نیز آب و ہوائی خطوں کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھیں۔

5۔ پاکستان کو ہم کتنے قدرتی خطوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ہر ایک کا حال مفصل بیان کریں۔

6۔ مناسب الفاظ سے جملے مکمل کریں۔

(1) پاکستان کا کل رقبہ ـــــ کلومیٹر ہے۔

(2) کوہ ہمالیہ ـــــ کی طرف تقریباً ـــــ کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے۔

(3) لداخ کا پہاڑی سلسلہ جسے ـــــ بھی کہتے ہیں۔

(4) دریائے کرم اور گومل ـــــ کا کوہستانی علاقہ ہے۔

(5) بہاولپور میں اس ریگستانی ـــــ کو ـــــ کہتے ہیں۔

7۔ صحیح یا غلط ہونے پر دیے گئے نشان پر دائرہ لگائیے :

(1) پاکستان کو آب و ہوا کے لحاظ سے 4 خطوں میں تقسیم کرتے ہیں ۔ (ص ۔ غ)

(2) پاکستان میں مون سونی بارش اکتوبر نومبر میں ہوتی ہے ۔ (ص ۔ غ)

(3) موسم سرما کی بارش بحیرۂ روم سے آنے والے گردبادوں سے ہوتی ہے ۔ (ص ۔ غ)

(4) درہ خیبر کی کل لمبائی 60 کلومیٹر ہے ۔ (ص ۔ غ)

(5) سردیوں میں بلوچستان کی آب و ہوا ناخوشگوار ہوتی ہے ۔ (ص ۔ غ)



پاکستان کا کلچر

کلچر انگریزی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی ہیں ، کسی چیز یا ذات کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما اور اصلاح وغیرہ۔ عام اصطلاح میں اس سے مراد انسان کی ذاتی اور اجتماعی نشو و نما کے جملہ پہلو ہوتے ہیں۔ ثقافت سے مراد کسی معاشرے کے افراد کا طرز زندگی و تمدن کا حسن ہوتا ہے۔ اس میں وہ تمام امور شامل ہوتے ہیں جن سے اس معاشرے کے افراد کے جمالیاتی ذوق ، تفریحی شوق اور فنی سہارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کلچر ایک کل ہوتا ہے ، جس میں اس کے بسنے والوں کے عقائد ، علوم ، طرز معاشرت ، عام معاملات زندگی ، فنون و ہنر ، قوانین غرض تمام ارادی اور غیر ارادی افعال کسی نہ کسی طور شامل ہوتے ہیں۔

کسی قوم کی شناخت اس کا کلچر ہوتا ہے۔ یہ اس قوم کی وہ قدر مشترک ہے جس سے نہ صرف اس کی پہچان ہوتی ہے بلکہ دوسرے معاشروں سے ممیز حیثیت کی شناخت بھی ہوتی ہے۔ قومی کلچر کی شناخت میں پہلی اکائی فرد ہوتا ہے۔ کلچر اس کی زندگی کا مقصد ، اصول اور اقدار معین کرنے میں مدد کرتا ہے۔ یہی رویہ ایک قومی سوچ اور اجتماعی تخلیق کو جنم دیتا ہے۔ چھوٹے بڑے علاقائی کلچر اور معاشرتی اکائیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر ایک وسیع تر رشتے میں نمودار ہو کر قومی سطح پر اٹھ جاتی ہیں۔

پاکستانی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم

اس کی تاریخ نیز اسلامی تعلیمات کی ہر جہت سے اس پر اثرات کا مختصراً جائزہ لیں ۔

کلچر انسانی کا آغاز :

انسان ابتدا میں حیوانوں کی سی زندگی بسر کرتا تھا اور نہ صرف محض بنیادی ضروریات کو ہی پورا کرنا جانتا تھا بلکہ ان ضروریات کی بار آوری کا انداز بھی غیر مہذبانہ تھا ۔ آہستہ آہستہ انسان نے اجتماعی سطح پر اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کیا ۔ یہی وہ دور ہے جب مہذب زندگی کا آغاز ہوا ۔ انسانی تہذیب کا یہ آغاز ان علاقوں سے ہوا جہاں آب و ہوا اور دیگر جغرافیائی حالات نسبتاً بہتر زندگی کے لیے موافق تھے ، چنانچہ دریاؤں کی زرخیز وادیوں میں تہذیب انسانی کی سحر نمودار ہوئی ۔ ان وادیوں میں وادیٔ نیل (مصر) وادیٔ دجلہ و فرات (عراق) اور وادیٔ سندھ (پاکستان) شامل ہیں ۔ یہ دریا اپنے ساتھ پہاڑوں کی زرخیز مٹی بہا لاتے اور میدانوں میں بچھا دیتے ۔ طغیانی سے قدرتی آبپاشی کا اہتمام ہو جاتا ، فصلیں بھی خوب ہوتیں ۔ کہیں کہیں دریائی کناروں کے ساتھ پھیلے ہوئے ریت کے ٹیلوں پر ہرن کا شکار بھی مل جاتا ۔ چونکہ ایسے خطوں میں انسان کے لیے بیشتر ضروریات میسر تھیں ، اس لیے ان علاقوں میں بالخصوص آبادی کا ارتکاز ہوا اور منظم معاشرہ وجود میں آیا ۔

پاکستانی کلچر کی قدامت و تنوع :

سرزمین پاکستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں قدیم ترین انسانی تہذیب نے جنم لیا ۔ اسے وادیٔ سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے ۔ یہ مصر اور عراق کی تہذیبوں کی ہم عصر تھی اور آج سے چار پانچ ہزار سال پہلے اپنے عروج پر تھی ۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بسنے والوں کے مقابلے میں یہ لوگ بہت زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب تھے ۔ جن علاقوں پر آج پاکستان مشتمل ہے ، ان کا محل وقوع ایسا ہے کہ یہاں وقتاً فوقتاً مختلف اقوام آ کر آباد ہوتی رہیں ۔ یہ علاقہ کچھ عرصہ ایرانی حکومت کے زیر اثر رہا ۔ بعد میں یونانی اور دیگر اقوام

یہاں آکر آباد ہوتی گئیں۔ مسلمانوں کی آمد سے یہ خطہ عالمِ اسلام کا حصہ بن گیا۔ آخر میں یورپی اقوام نے تسلط جمایا۔ یوں یہ علاقہ دنیا کی مختلف تہذیبوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اس علاقے کی تہذیب نہ صرف قدیم ہے بلکہ اس میں بڑا تنوع بھی ہے اور اس میں مشرق و مغرب کی ثقافت کی تمام خصوصیات جمع ہو گئی ہیں۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب: وادیٔ سندھ سے مراد وہ علاقہ ہے جسے دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا سیراب کرتے ہیں۔ موجودہ نام پاکستان ہے۔ موئن جودڑو (ضلع لاڑکانہ۔ سندھ) اور ہڑپہ (ضلع ساہیوال۔ پنجاب) کے مقامات پر قدیم ٹیلوں کی کھدائی کی گئی تو ایسے آثار قدیمہ سامنے آئے جن سے اس قدیم تہذیب کا پتا چلا۔ کھدائی کے ذریعے جو اشیا برآمد ہوئیں، ان میں سب سے اہم تو خود ان شہروں کے کھنڈرات ہیں۔ شہر کی عمارت، گلی کوچے، بازار، نالیاں، حمام کافی حد تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار دیگر اشیا ہیں جن سے اس زمانے کی تہذیب و تمدن، طرزِ زندگی، مذہب وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں گندم و جو کے ذخیرے، کھجور کی گٹھلیاں، انسان اور پالتو جانوروں کے پنجر، روئی کا کپڑا، روئی کاتنے کے اوزار، آلاتِ جنگ، کلہاڑی، چاقو، سونے چاندی کے زیورات، مٹی و تانبے کے برتن، کھلونے، مہریں، پتھر، مٹی اور دھاتوں کے مجسمے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

شہروں اور عمارات کی ساخت: کھنڈرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب شہری تھی۔ موئن جودڑو اور ہڑپہ کے شہر وسیع اور گنجان آباد تھے۔ محلوں، گلی کوچوں اور بازاروں کی تعمیر و ترتیب میں نہایت محنت سے کام لیا گیا تھا۔ گلیاں کافی کشادہ تھیں۔ ان کا عرض 33 فٹ تک تھا۔ صفائی کا اعلیٰ انتظام تھا۔ گلیوں میں نالیاں موجود تھیں جو پختہ اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ شہروں کی عمارات بھی پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ ان سب

کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس علاقے کے رہنے والوں کا ذوق اعلیٰ تھا۔

رہائشی مکانات کی تعمیر میں بڑا سلیقہ نظر آتا ہے۔ بیرونی دیواروں کے علاوہ فرش بھی پختہ اینٹوں سے تیار کیے گئے تھے۔ گھروں میں تازہ ہوا اور روشنی کا معقول انتظام تھا۔ موسم کی شدت سے بچنے کے لیے گھروں کے نیچے تہ خانے بنائے جاتے تھے جن میں روشنی اور ہوا کا مناسب بندوبست تھا۔ پینے کے پانی کے لیے کنوئیں موجود تھے۔ گھر کے غسل خانے کشادہ اور صاف تھے۔

اسباب خانہ داری و کھلونے : گھر کے استعمال کے لیے برتن زیادہ تر پختہ مٹی، تانبے اور کانسی کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ ان برتنوں میں مٹکے، پیالے، طشتریاں اور گھڑے شامل تھے۔ چاقو، آریاں، کلہاڑے اور تانبے و کانسی کے بنے ہوئے دیگر اوزار ملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ لوہے کے استعمال سے ناواقف تھے۔ ہڈیوں اور ہاتھی دانت کی سوئیاں اور کنگھیاں بھی ملی ہیں۔

ان لوگوں کو کھلونوں کا بہت شوق تھا۔ بڑی تعداد میں دستیاب شدہ کھلونوں میں انسانوں اور جانوروں کے مٹی کے مجسمے شامل ہیں۔ ایک کھلونا رتھ کی شکل کا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ پہیے کا استعمال جانتے تھے۔

تجارت : اشیائے استعمال کی ساخت میں کئی دھاتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں چاندی، تانبہ، کانسی اور ٹین واضح ہیں۔ زیورات میں جواہرات کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ دھاتیں وادیٔ سندھ میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ دور دراز ممالک میں تجارت کی غرض سے جاتے تھے اور دھاتیں درآمد کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ افغانستان سے تانبہ، ترکستان سے جواہرات اور خراسان سے ٹین درآمد کرتے تھے۔

لباس و زیبائش : کھنڈرات میں روئی کے کپڑے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا

ملا ہے جس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اس زمانے میں سوتی کپڑا بُنا جاتا تھا۔ روئی کاتنے کے اوزار بھی کثرت سے برآمد ہوئے ہیں۔ جس قسم کا لباس اس وقت مروج تھا، اسے جاننے کے لیے ہمارے پاس چند مجسمے ہیں۔ ان مجسموں نے شال اوڑھ رکھی ہے، جس پر بیل بوٹے کا کام کیا ہوا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہی لباس اس زمانے میں رائج ہوگا۔

وادیٔ سندھ کے مرد و عورتیں زیورات کے شوقین تھے۔ ان زیورات میں زیادہ تر انگوٹھیاں، ہار، بالیاں اور چوڑیاں تھیں۔

آلات جنگ: آلات جنگ بہت کم تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے اسلحہ میں تانبے اور کانسی کے بنے ہوئے تیر کمان، خنجر اور کلہاڑے ملے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ امن پسند اور متمدن تھے۔ انھوں نے فنون جنگ میں زیادہ ترقی نہیں کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں نے انھیں مغلوب کر لیا۔

مذہب: مذہب سے متعلق معلومات کے لیے بھی ہمارے ذرائع مجسمے اور بُت ہیں۔ ان میں بیشتر برہنہ عورتوں کے بُت ہیں۔ ماہرین نے رائے قائم کی ہے کہ یہ ماتا دیوی کے بت ہیں جس کی یہ لوگ پرستش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تین سروں والے دیوتا کے مجسمے بھی ملے ہیں۔ یہ لوگ مظاہرِ قدرت اور پتھروں کی پوجا بھی کرتے تھے۔ مُردوں کو دفن کرنے کا بھی رواج تھا۔

گندھارا آرٹ: پنجاب اور سرحد کے ان علاقوں کو جو اس وقت راولپنڈی اور پشاور کے گرد و نواح میں واقع ہیں، قدیم زمانے میں گندھارا کا نام دیا جاتا تھا۔ آج سے دو اڑھائی ہزار سال پہلے یہاں بلند پایہ تہذیب پروان چڑھ چکی تھی جس کے فنون لطیفہ بالخصوص فن سنگ تراشی نے ساری دنیا سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ یہ علاقہ کچھ عرصہ تک پہلے ایران اور پھر یونان کے زیر اثر رہا۔ اس لیے ہندی، ایرانی اور یونانی تہذیبوں نے مل کر یہاں ایسی عظیم تہذیب کو جنم دیا جس میں ساری متمدن دنیا کی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں۔

گندھارا کا ثقافتی مرکز ٹیکسلا تھا جو اسلام آباد کے قریب واقع ہے۔ یہ شہر علم و فن کا مرکز تھا۔ یہاں کی درسگاہیں یونیورسٹی کا درجہ رکھتی تھیں جہاں دیگر ممالک کے طلبہ بھی تحصیل علم کی غرض سے آتے تھے۔ گندھارا کے علاقے سے سنگ تراشی اور مجسمہ سازی کے بے شمار نادر نمونے ملے ہیں جو اس وقت ٹیکسلا کے عجائب گھر میں موجود ہیں۔

مجسمہ سازی کے فن پر یونانی اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ خیالات، نظریات اور موضوع مثلاً گوتم بدھ کی زندگی، اس کی حالتِ مراقبہ وغیرہ تمام تر مقامی ہیں لیکن سنگ تراشی کی طرز بالکل یونانی ہے۔ بتوں کے خد و خال، لباس، بالوں کی بناوٹ، آرائش وغیرہ سب یونانی انداز میں ہیں۔ گویا یہ آرٹ مشرق و مغرب کے ملاپ کا نتیجہ تھا۔

پاکستان کا ثقافتی ورثہ

ثقافت سے مراد کسی معاشرے کے افراد کی طرز زندگی و تمدن کا حسن ہے۔ اس میں وہ تمام امور شامل ہوں گے جن سے اس معاشرے کے افراد کے جمالیاتی ذوق، تفریحی شوق اور فنی مہارت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ یوں ثقافت میں کسی قوم کے وہ علوم و فنون اور نظریات شامل ہوں گے، جو اسے دوسری قوموں سے منفرد اور ممتاز کرتے ہوں۔ عرف عام میں فنون لطیفہ اور آرٹ کو ثقافت کا مظہر خیال کیا جاتا ہے۔

مسلمان پہلی بار 712ء میں اس سرزمین پر فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ یوں اس خطہ زمین میں ایک نئی ثقافت کا دور شروع ہوا جو اپنی ہیئت اور روح کے اعتبار سے بہت بلند پایہ تھی۔ اس عہد میں فن تعمیر، مصوری، خطاطی اور موسیقی کے فن کو ترقی ملی۔ یہ سب کچھ پاکستان کے ثقافتی ورثے کا حصہ ہے۔

مسلم فن تعمیر کی خصوصیات: کسی قوم کا فن تعمیر اس کے ذوق اور طبعی وجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مسلم فن تعمیر ہر لحاظ سے منفرد تھا اور

وہ ہندو تعمیرات سے بالکل جداگانہ اور ارفع خصوصیات کا حامل تھا :

(i) مسلم عمارات کشادہ ، وسیع اور روشن ہوتی تھیں ۔ ماہرین کے نزدیک اس کی وجہ خود دین اسلام کی کشادگی اور وسیع النظری ہے جس کی جھلک فن تعمیر میں ملتی ہے ۔ اس کے برعکس ہندو عمارات تنگ و تاریک ہوتی تھیں ۔

(ii) مسلم عمارات میں ان کے مختلف حصوں کے باہمی تناسب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا ۔ غیر ضروری آرائش سے اجتناب کرتے ہوئے یہ کوشش کی جاتی تھی کہ عمارات بحیثیت مجموعی خوش منظر اور دلفریب ہوں ۔

(iii) صحیح محراب کے اصول پر صحیح گنبد بھی مسلمانوں نے بنایا ۔ مسلم عمارات کے گنبد انتہائی خوبصورت تھے ۔ بعض عمارات میں دوہرے گنبد بھی بنائے گئے یعنی پہلے ایک پست گنبد بنایا جاتا جس کے اندر کی طرف آرائش کی جاتی تا کہ عمارت کے اندر بیٹھ کر اس کے حسن کا نظارہ کیا جا سکے ۔ اوپر ایک اور بلند گنبد بنایا جاتا تاکہ باہر سے کافی فاصلے سے بھی نظر آئے اور یوں دور سے بھی عمارت کا حسن دعوت نظارہ دے ۔

(iv) مسلمانوں نے اپنی عمارتوں میں عمودی خطوط کو رواج دیا یعنی میناروں ، گنبدوں وغیرہ کی لکیریں نیچے سے اوپر کو جاتی تھیں ۔ اس سے عمارت کی رفعت نمایاں ہوتی تھی ۔ ہندوؤں کے ہاں افقی خطوط رائج تھے جن سے عمارت کے بھاری پن کا تاثر ملتا ہے ۔

(v) مسلم عمارات کا افقی حصہ یعنی اوپر کا خط ایک سیدھی لکیر میں کبھی نہیں ہوتا تھا ۔ وہ اس خط کو میناروں ، گنبدوں ، چھتریوں وغیرہ سے توڑتے تھے اور یوں افقی حصے کا نشیب و فراز عمارت کے حسن کو دوبالا کر دیتا تھا ۔

مسلم عہد کی اہم عمارات میں سے قطب مینار دہلی ، علائی دروازہ ،

مقبرہ غیاث الدین تغلق ، مقبرہ شیر شاہ سوری ، قلعہ آگرہ ، تاج محل آگرہ ، لال قلعہ دہلی ، جامع مسجد دہلی ، مقبرہ جہانگیر لاہور ، شاہی قلعہ لاہور ، بادشاہی مسجد لاہور ، مسجد وزیر خان لاہور ، جامع مسجد ٹھٹھ ، مسجد مہابت خان پشاور ، شالا مار باغ لاہور زیادہ مشہور ہیں - ان میں سے آخری مات پاکستان میں واقع ہیں -

مقبرہ جہانگیر لاہور :

یہ مقبرہ جہانگیر کی ملکہ نور جہان کی نگرانی میں تعمیر ہوا - اگرچہ سکھوں کے ہاتھوں اسے بہت نقصان پہنچا اور رنجیت سنگھ نے سنگ مرمر کا پورا شہ نشین اکھاڑ دیا ، اس کے باوجود یہ مغل عہد کی عظیم عمارت ہے - اس میں مرصع کاری ، کاشی کاری (ٹائلیں) اور ہندسی نقش نگاری کا کام نہایت دیدہ زیب ہے -

شاہی قلعہ لاہور :

لاہور کا قلعہ بادشاہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا - شاہ جہان اور اورنگ زیب نے اس میں کئی نئی عمارات بنوائیں - ان میں شیش محل ، نولکھا ، دیوان خاص ، موتی مسجد وغیرہ سکھوں کی دست برد سے کسی حد تک محفوظ رہیں -

بادشاہی مسجد لاہور :

یہ عظیم الشان مسجد اورنگ زیب کے دور میں تعمیر ہوئی - یہ وسعت کے لحاظ سے دنیا کی عظیم ترین مساجد میں سے ہے اور اسلامی عظمت و شوکت کا تاثر پیش کرتی ہے - عمارت سنگ سرخ سے بنی ہے البتہ گنبد سنگ مرمر کے ہیں -

مسجد وزیر خان :

قدیم شہر لاہور کے اندر واقع یہ مسجد فنی نقطہ نگاہ سے منفرد ہے -

اس میں ایرانی طرز کی کاشی کاری (چمکدار ٹائلوں) کے نہایت عمدہ نمونے اور نقش و نگار دیکھے جا سکتے ہیں۔

جامع مسجد ٹھٹھہ:

سندھ کی یہ عظیم ترین تاریخی مسجد ہے جو شاہ جہانی دور کی یادگار ہے۔ اس کی رنگین آرائشی ٹائلیں آج بھی دلکش سماں پیش کرتی ہیں۔

مسجد مہابت خان پشاور:

پشاور شہر کے اندر یہ مسجد مہابت خان نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کا شمار بھی مغل عہد کی عظیم یادگاروں میں ہوتا ہے۔

دیگر اہم مسلم عمارات میں شالا مار باغ لاہور، چوبرجی لاہور اور مقبرہ شیخ رکن الدین (رکن عالم) ملتان قابلِ ذکر ہیں۔

مصوری: مسلمان جنوبی ایشیا میں اپنے ساتھ بغداد کی فنی روایات لائے۔ شروع میں محلات اور دیگر عمارات کی دیواروں اور چھتوں پر آرائشی تصاویر اور نقش و نگار بنائے گئے۔ رفتہ رفتہ فن مصوری کی روایات زیادہ پختہ ہوتی گئیں۔

مغل فرماں روا فن مصوری کے دلدادہ تھے۔ ہمایوں ایران سے دو مصوروں میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد کو اپنے ساتھ لایا۔ انہوں نے داستانِ امیر حمزہ کا مصور نسخہ تیار کیا۔ اکبر کے دور میں مصوروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا اور اس فن نے بہت ترقی کی۔ رنگوں کا حسین امتزاج خاص طور پر کمال کو پہنچا۔ مصوروں نے متعدد کتابوں کے باتصویر نسخے تیار کیے اور اس عہد کی عمارات پر آرائشی تصاویر بنائیں۔

جہانگیر کو اس فن میں بے حد دلچسپی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ محض تصویر دیکھ کر وہ مصور کو پہچان سکتا تھا۔ اس عہد میں فن مصوری نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔ پھولوں، پودوں، جانوروں، پرندوں اور قدرتی مناظر کی نہایت خوبصورت تصاویر بنائی گئیں۔ جنگوں، محاصروں اور جانوروں کی لڑائیوں کی تصاویر حقیقت نگاری اور دلفریبی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

موسیقی : فن موسیقی کو ترقی دینے میں مسلمانوں کی روایات نہایت شاندار ہیں ۔ مسلم معاشرے میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ فارابی اور ابن سینا جیسے مفکرین اور حکما نے بھی اس پر کتابیں لکھیں ۔ مسلم فاتحین یہ روایات لے کر جنوبی ایشیا میں آئے ۔ دوسری طرف ہندو فن موسیقی بھی بہت قدیم تھا ۔ ان دونوں کے امتزاج سے نئے نئے تجربوں کا آغاز ہوا ۔ مسلم فنکاروں نے نئے ساز اور نئے راگ ایجاد کیے ۔ یوں فن موسیقی اوجِ کمال کو پہنچ گیا ۔ جنوبی ایشیا کے متعدد راگوں اور سازوں کے نام آج بھی عربی و ایرانی اصل کا پتا دیتے ہیں ، مثلاً راگ ایمن کلیان ، کافی ، حسینی کانڑا اور ساز جیسے ستار ، دلربا ، شہنائی ، سرود ، رباب وغیرہ ۔

مسلم سلاطین کے علاوہ چشتی سلسلہ کے صوفیا نے بھی اس فن کو مقبولیت عامہ بخشنے میں اہم حصہ لیا ۔ محفلوں میں اکثر قوالی ہوتی تھی ۔

امیر خسرو مسلم عہد کے اوّلین عظیم موسیقار تھے ۔ انھوں نے موسیقی میں متعدد نئے راگوں کا اضافہ کیا ۔ ان کے کمال کو ہندوؤں نے بھی تسلیم کیا ۔ مغل عہد میں موسیقی ، تہذیب کا اہم جزو سمجھی جاتی تھی ۔ کم و بیش سارے مغل فرماں روا خود بھی موسیقی میں مہارت رکھتے تھے ۔ گوالیار کا نو مسلم میاں تان سین اس عہد کا شہرہ آفاق موسیقار تھا ۔ وہ تاعمر دربارِ اکبری کی زینت رہا ۔ راگ کی کئی اقسام مثلاً میاں کی ملہار ، میاں کی ٹوڈی ، درباری کانڑا وغیرہ اس کی ایجاد ہیں ۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی قبر پر اگے ہوئے املی کے درخت کے پتے آج بھی اس امید میں چبائے جاتے ہیں کہ اس سے گلا سریلا ہو جائے گا ۔

میاں تان سین کا لڑکا بلاس خاں اور داماد لال خاں بھی اس فن کے استاد تھے ۔

خطاطی : مسلمانوں نے ہمیشہ فن خطاطی کو فروغ دینے میں گہری دلچسپی لی ۔ اس کی بڑی وجہ قرآن پاک سے ان کی قلبی محبت ہے ۔ جنوبی ایشیا

کے مسلم معاشرے میں تو اس وقت تک کسی کو خواندہ اور مہذب خیال نہیں کیا جاتا تھا جب تک کہ وہ خوش نویس نہ ہو۔ اس دور میں خطوں کی متعدد اقسام نے ترقی کی۔ کتابوں کے علاوہ عمارات پر بھی خطاطی کے اعلیٰ نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔

مغلیہ خاندان میں آخری طاقت ور بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر تھا۔ اس کی وفات (1707ء) کے بعد پوری سلطنت میں مقامی باشندوں کی بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اس میں مرہٹے جاٹ، سکھ اور راجپوت شامل تھے۔ دوسری طرف یورپی اقوام میں پرتگیزیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے اپنے سامراجی تسلط کو پھیلانے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربے شروع کر دیے تھے۔

ان حالات میں ملکی سیاست پر مسلمانوں کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ان سیاسی کمزوریوں کے اثرات جملہ ثقافتی اداروں پر بھی ہونا تاریخی حقیقت تھی۔ اس سیاسی کمزوری اور خلفشاری میں اسلامی اقدار اور اسلامی روایت و ثقافت پر دھچکے کا احساس شاہ ولی اللہؒ کو ہوا۔ انہوں نے ہمسایہ ملک کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو برصغیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ 1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی مگر انتشار کا سلسلہ جاری رہا۔ میسور کے سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو، بنگال کے تیتومیر اور حاجی شریعت اللہ نے ہر لحاظ سے مسلمانوں کو اس سیاسی و ثقافتی بحران سے نکالنا چاہا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اسلامی روایات کی سربلندی اور حفاظت کے لیے آخری معرکہ 1857ء کی جنگ آزادی کی صورت میں ہوا مگر اس میں بھی مسلمانانِ جنوبی ایشیا کا بس نہ چلا اور آخر اس علاقے میں انگریز راج نافذ ہو گیا۔

انگریزوں کے اس علاقے میں آنے کے بعد جو فوری مسائل شدت سے ابھرے، ان میں چند ایک یہ ہیں:

1۔ انگریز اپنے ساتھ ایک سامراجی نظام لائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مقامی ثقافتی و سماجی اداروں کو اس طرح کے سیاسی ڈھانچے میں جکڑ

دبا جائے کہ ان کے تشخص کی شناخت ہی باقی نہ رہے۔

2۔ ہندوؤں نے فوری طور پر انگریزوں سے اتحاد کر لیا اور مراعات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ انگریز مسلمانوں کے سخت خلاف تھے جس کی وجہ جنگ آزادی 1857ء میں مسلمانوں کی اس علاقے سے انگریزوں کو نکالنے کی کوشش تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ انگریز کسی طور پر بھی مسلمانوں کو مراعات یا ڈھیل نہ دے سکتے تھے۔

ان حالات میں ہندوؤں کو اپنی سماجی و ثقافتی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی مکمل آزادی تھی مگر مسلمانوں پر ہر لحاظ سے زمین تنگ کی جا رہی تھی۔ انگریز ہندوؤں کی مدد سے ایسا سیاسی ڈھانچہ بنا رہے تھے جس میں مسلمانوں کی تمام تر ثقافتی ترقی مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ انھیں مذہبی آزادی نہ ہونے کے برابر تھی، تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مفقود تھے۔ ایسے حالات میں مسلمان رہنماؤں نے کمر بستہ ہو کر اسلامی روایات و ثقافت کو سنبھالا دینے کے جتن کیے۔ اس کا مختصر جائزہ ذیل کی سطور میں درج ہے:

وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی تعلیمی ضروریات بھی بدل جاتی ہیں۔ انگریزوں کے آنے کے بعد جنوبی ایشیا میں جدید علوم کی آمد ہوئی۔ ان نئے تقاضوں کے پیش نظر ضروری تھا کہ تعلیمی نظام کو نئی جہتوں پر استوار کیا جائے۔ اس کام کی ذمہ داری سرسید احمد خان نے سنبھالی۔ انھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ جدید علوم سیکھیں اور اس میں اعلیٰ مقام حاصل کریں تا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں ان کی حیثیت ارفع و اعلیٰ رہے۔ علی گڑھ کالج اور بعد ازاں یونیورسٹی کا قیام مسلم ثقافت و تہذیب کو ٹھہراؤ دینے کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ اس ادارے نے مسلمانوں کو بعد ازاں عظیم قائدین دیے جن میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک وغیرہ شامل ہیں۔ ان قائدین نے مسلم تشخص اور مسلمانان جنوبی ایشیا کی بیداری میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

مذہب اسلام ہی مسلمانوں کی شناخت ہے اور اسلامی ثقافت کا مرکز

اولیٰ ۔ ان ایام دگرگوں میں جب کہ ہندو انتہا پسند تحریکوں (شدھی ، سنگھٹن ، آریاسماج) اور عیسائی مشنریوں نے اسلام پر پے درپے حملے شروع کر رکھے تھے ، اس ضرورت کا احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ اسلامی تعلیمات کی ترویج و اشاعت بڑے اعلیٰ پیمانے پر کی جائے ۔

اس عصری ضرورت کے پیش نظر 1920ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی ۔ اس جامعہ کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہاں دینی علوم کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم پر بھی زور دیا جاتا تھا تا کہ طالب علموں کو اپنے معاش کے سلسلے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دیو بند نے بھی اس سلسلے میں خاطر خواہ خدمات انجام دیں ۔

فکری سطح پر بھی مسلمان علما اور دانشوروں نے مسلم ثقافت پر اس وقتی گھٹن کو بھانپ لیا تھا ، اس لیے انھوں نے بھی اپنی پوری قوت اسی کی طرف لگا دی ۔ ان میں مولانا شبلی نعمانی نے اسلامی تاریخ اور روایات پر معیاری کتب تصنیف کیں اور مخالفین کو سمجھانے کی سعی کی کہ اسلام اور اس کی روایات و ثقافت ، تاریخ عالم کا ایک عظیم سرمایہ ہے ؛ اس کو محض سیاسی دباؤ میں کچلنا آسان نہیں ، اس کا ایک شرارہ بھی الاؤ بن سکتا ہے کیونکہ اس ثقافت کا ورثہ نہایت عظیم اور اعلیٰ اقدار کا حامل ہے ۔ اس ضمن میں سرسید احمد خاں اور بعض دیگر ہم عصروں مولوی ذکاء اللہ ، مولانا الطاف حسین حالی نے اجتماعی فکری سعی میں نہایت عالی قدر کتب تصنیف کیں ۔

مگر ان سب میں سے جس شخصیت نے نہایت گہرے اور ٹھوس نقوش تاریخ ثقافت اسلام پر چھوڑے ، وہ ڈاکٹر علامہ اقبال تھے ۔ ان کی شاعری کا محور مسلمانان جنوبی ایشیا اور پوری اسلامی امہ تھا ۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان اگر اپنی سابقہ روایات کی سربلندی کے لیے اپنے اندر خود داری اور جہد مسلسل کا جذبہ پیدا کر لیں تو دنیا کی کوئی قوم ان کو محکوم نہیں بنا سکتی ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلامی روایات اور ثقافت اتنا وسیع سرمایہ ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں : وہ امت واحدہ ہیں ۔ اسلام نے ان کو ایک مضبوط

رسی میں پرو رکھا ہے اور یہ رشتہ مستقل اور اٹوٹ ہے۔

سیاسی طور پر علامہ اقبال نے اسلامی ثقافت کی حفاظت میں اس قدر اہم کردار ادا کیا کہ اس کی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ انہوں نے الٰہ آباد میں منعقدہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس 1930ء میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جنوبی ایشیا (ہندوستان) کے مسلم اکثریت کے شمالی مغربی علاقوں، سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان کو ملا کر ایک اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے، جہاں پر خالص اسلامی انداز کے مطابق لوگ بغیر کسی مداخلت کے زندہ رہ سکیں اور اس میں صحیح مسلم ثقافت کی عمل داری ہو۔

اسی کی روشنی میں قیام پاکستان عمل پذیر ہوا اور مسلمانان جنوبی ایشیا کو ایک خطۂ زمین نصیب ہوا جس سے متعلق قائد اعظم نے فرمایا تھا:

> "ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک سرزمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلامی اصولوں پر عمل کر سکیں۔"

الغرض یہ کہ مسلمانوں کی جنوبی ایشیا میں آمد سے لے کر پاکستان کے قیام تک کے زمانے میں سے 1857ء سے 1947ء کا دور مسلم ثقافت اور روایات کے لیے ایک کٹھن دور تھا مگر مسلمانانِ جنوبی ایشیا نے اپنے عظیم قائدین کے زیر سرپرستی اس اسلامی ساکھ اور روایات کے عظیم خزانے کو بچا لیا اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے پاکستان کے نام سے ایک آزاد اسلامی مملکت حاصل کر لی۔

پاکستانی کلچر کے خد و خال: آج پاکستان جس مقام پر کھڑا ہے اور پاکستانی کلچر کے جو خد و خال ہمیں نظر آتے ہیں، اس میں ہمارے ہزاروں سال کے اس ثقافتی سفر کا بہت حصہ ہے جس کا مختصراً ذکر ہم پڑھ آئے ہیں۔ ہمارے میلانات، ہمارے فنون، دست کاریوں، رہن سہن، لباس، خوراک وغیرہ میں بہت کچھ اب بھی ایسا ہے جسے سمجھنے و پرکھنے کے لیے ہمیں اپنے

ماضی میں بہت پیچھے جانا پڑتا ہے ، مگر پچھلے ایک ہزار سال سے مذہب اسلام نے ہماری تہذیب و ثقافت کی نوک پلک درست کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

مذہبی یک جہتی : ہمارے کلچر کی سب سے بڑی خوبی اس کا اسلامی رنگ ہے۔ آبادی کی غالب اکثریت کا مذہب اسلام ہے اور یہی ایک مضبوط کڑی ہے جو ہمیں بھائی چارے ، محبت اور دوستی کے لازوال رشتوں میں باندھے ہوئے ہے کیونکہ اسلام نسلی برتری ، ذات پات اور علاقائی نخوت کی نفی کرتا ہے۔ ایک علاقے کے لوگ ، دوسرے علاقے کے لوگوں کے ساتھ ، ایک پیشے والے ، دوسرے پیشے والوں کے ساتھ اور ایک ذات والے لوگ ، دوسری ذات کے لوگوں میں میل جول اور رشتہ داریاں آزادانہ کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک میں جملہ اقلیتوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر طرح کی مراعات اور آزادی حاصل ہے۔ یہ طرز عمل ملکی اتحاد و یک جہتی کے لیے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

مخلوط کلچر : پاکستانی کلچر ایک مخلوط کلچر ہے۔ اپنی ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے بڑا پہلو دار ہے۔ مختلف زاویوں سے دیکھنے سے اس کے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کے لوگوں پر ان کے ارد گرد کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور یہ اثرات ان کے لباس ، خوراک اور رہن سہن میں واضح ہوتے ہیں۔ مقامی قدیم باشندوں کے علاوہ یہاں عربی ، ایرانی ، اور تورانی سبھی نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ ہر گروہ اپنے ساتھ اپنے اپنے علاقائی اور نسلی رسم و رواج ، رہن سہن کے طریقے ، لباس اور زبان لے کر آیا تھا۔ اس گروہی ثقافت نے دوسرے گروہوں پر اثر ڈالا۔ ان تمام ثقافتی دھاروں کا مرکز پاکستانی کلچر ہے جو سب کی پہلی اور آخری شناخت ہے۔ اس تمام تر ثقافتی روشنی کا منبع اسلام ہے۔

مرد اور عورت کا مقام : پاکستانی معاشرے میں مرد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ خاندان کا سربراہ ہوتا ہے۔ نسل باپ کے نام سے چلتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی معاشرت میں عورت کو بھی اہم مقام حاصل

ہے۔ گھر کے اندر اسی کی حاکمیت ہے۔ گھر کی دیکھ بھال اور اولاد کی تربیت اسی کی ذمہ داری ہے۔ عورت کو تعلیم حاصل کرنے ، جائداد بنانے ، کاروبار کرنے اور وراثت میں حصہ طلب کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ شادی میں اس کی رضا مندی لازمی ہے۔ پاکستانی ثقافت کی بنیاد چونکہ اسلام ہے ، اس لیے مرد اور عورت کے حقوق کا تعین اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی پر عمل ہوتا ہے۔

معاشرت : پاکستانی معاشرت بنیادی طور پر سادہ اور حیا دار ہے۔ لوگ عام طور پر روایت پسند ہیں اور ان کے رسم و رواج سادہ اور دلچسپ ہیں۔ زیادہ تر لوگ مشترکہ خاندانی نظام کے زیر اثر زندگی گزارتے ہیں۔ بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے پیار کیا جاتا ہے۔ لوگوں میں روا داری اور برد باری کا جذبہ موجود ہے۔ عورت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی عزت کی ہر صورت حفاظت کی جاتی ہے۔ گھر زیادہ تر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ وہ باپردہ ہوں۔ زیادہ تر آبادی دیہات میں ہے جہاں لوگ کھیتی باڑی کر کے اور مویشی پال کر زندگی گزارتے ہیں۔ شہروں میں لوگ نوکر پیشہ اور تاجر ہیں۔ شادی بیاہ اب بھی روایتی انداز میں ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر پاکستانی معاشرت روایت پسند ہونے کے ساتھ وقتی تقاضوں سے بھی ہمیشہ ہم آہنگ رہتی ہے اور اس طرح معاشرتی ترقی کا عمل جاری رہتا ہے۔

لباس : پاکستان کا قومی لباس نہایت سادہ اور باوقار ہے۔ مرد شلوار قمیص یا کرتہ شیروانی اور ٹوپی یا پگڑی پہنتے ہیں۔ عورت کے لیے شلوار قمیص اور دوپٹہ عام لباس ہے۔ علاوہ ازیں ہر علاقے کا اپنا لباس ہے جو بعض علاقوں میں نہایت خوش رنگ ، بارعب اور باوقار ہونے کے ساتھ ساتھ پہننے والے کے اعلیٰ ذوق کا ضامن بھی ہے۔ علاقائی لباسوں میں شلوار قمیص ، تہمد پگڑی اور ٹوپی بڑی حد تک قدرِ مشترک ہے۔ کڑھائی والا لباس بھی عورتوں میں مقبول ہے ؛ صرف علاقے کے لباس کی کانٹ چھانٹ ، رنگ اور ڈیزائن مخصوص

ہوتے ہیں مگر تمام تر لباس حیا دار اور پردے کے تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں۔

خوراک : پاکستان میں عام لوگوں کی روزمرہ کی خوراک نہایت سادہ ہے۔ گندم کی روٹی یا چاول کے ساتھ گوشت ، دال ، سبزیوں کی ترکاری استعمال کرتے ہیں اور پینے کے لیے بھینس کا دودھ ، چھاچھ ، قہوہ اور سادہ پانی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہاں البتہ شادی بیاہ اور دعوتوں میں پرتکلف کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ البتہ علاقائی موسمی تغیر و تبدل کے زیر اثر ، مختلف علاقوں میں بعض غذائیں دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ مقبول ہیں۔ مثال کے طور پر اہل سرحد چونکہ سرد اور خشک علاقے میں رہتے ہیں ، اس لیے وہاں گوشت کا استعمال نسبتاً زیادہ کیا جاتا ہے۔ سندھ اور پنجاب میں دودھ ، دہی ، گھی ، سبزیاں وغیرہ پسند کی جاتی ہیں۔ بلوچستان میں دلبے کا گوشت ، پھل اور خشک میوہ ہر دلعزیز ہے۔

فن تعمیر : پاکستان کے فن تعمیر کے پیچھے ہزاروں سالوں کی روایات کارفرما ہیں۔ ہمارے لوگ ہمیشہ سے ماہر تعمیرات رہے ہیں۔ موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کی شہری تقسیم و تنظیم اور خانقاہوں کی تعمیرات ، اسلامی دور کے باغات ، محلات ، قلعے ، مقبرے اور مسجدیں ، ان کے سجاوٹی نقش و نگار دیکھ کر ان لوگوں کی تعمیرات میں فنی مہارت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ موہنجوداڑو اور سرکپ کے شہر ، تخت بائی اور جولیاں کی خانقاہیں ، اٹک اور رہتاس کے قلعے ، لاہور کے محلات ، شالیمار کے باغات ، لاہور اور ٹھٹھہ کی بادشاہی مسجدیں ، شاہ رکن عالم (ملتان) ، جام نظام الدین (مکلی) اور جہانگیر کا مقبرہ ہمارے فن تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ عام سرکاری عمارات اور پبلک عمارات میں ہمیشہ وقت کے رجحانات اور میلانات کا ساتھ دیا گیا ہے مگر گھریلو فن تعمیر میں جدید رجحانات کے ساتھ صدیوں پرانا انداز ، صحن ، برآمدہ ، کمرے اور ہموار چھت ابھی تک معروف ہے۔

فنون : کئی فنون میں اہل پاکستان نے کمال حاصل کر رکھا ہے۔

دھاتوں سے برتن ، زیورات اور آلات بنانے کا فن اس خطے میں رہنے والوں نے پانچ چھے ہزار سال پہلے سیکھ لیا تھا۔ ہاں البتہ لوہے کا استعمال بعد میں 1000ق م میں شروع ہوا تھا۔ موہنجودڑو کے لوگ کانسی کو پگھلا کر ڈھالنے کے فن سے بخوبی روشناس تھے۔ اسی دور میں پتھر تراش کر مختلف اشیا بنانے اور مہریں کندہ کرنے کا فن بھی اپنے عروج پر تھا۔ سن عیسوی کی پہلی پانچ صدیوں میں شمالی پنجاب اور صوبہ سرحد (قدیم گندھارا) میں سنگ تراشی کا فن اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ یہ فن بدھ مت کے عروج کے زمانے میں یونانی اور مغربی ایشیائی اثرات کا حامل ہے۔ اب بھی اس علاقے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو سنگ تراشی کا کام بڑی خوب صورتی سے کر لیتے ہیں۔

اسلام کا عمل دخل بڑھا تو فن کے بارے میں آہستہ آہستہ ترجیحات ، میلانات اور رجحانات بھی بدلنے لگے۔ بت تراشی کی جگہ عماراتی سنگ تراشی نے لے لی۔ چوکنڈی اور مکلی کے بے شمار مقبرے اس فن کے بہترین نمونے ہیں۔ مسلمانوں نے بالخصوص مغلوں نے ان علاقوں میں جن پر آج پاکستان مشتمل ہے ، اپنی عمارتوں کی بیرونی سطح کو روشن ٹائیلوں اور سجاوٹی اینٹوں سے سجایا۔ عمارتوں کے اندرونی حصوں کو تصویروں اور بتوں سے سجانے کی بجائے ، دیواروں پر رنگوں سے ہندسی اشکال اور بیل بوٹوں والے پیچیدہ ڈیزائینوں سے آراستہ کیا۔ لاہور ، ملتان ، اچ شریف اور ٹھٹھہ کی بے شمار عمارتیں مسلمانوں کے اسی جمالیاتی دور کا مظہر ہیں۔

ہمارے علاقے کے رہنے والے تصویر کشی کے فن سے قدیم زمانے سے واقف چلے آ رہے ہیں۔ بت کڑا (سوات) سے ملنے والی چونے کی دیوار پر بنی ہوئی ایک رنگین تصویر سے پتا چلتا ہے کہ ہمارے ہاں دیواری تصویروں نے اس زمانے میں رواج پا لیا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ تصویر کشی کے فن کی مسلمانوں نے ہی زیادہ سرپرستی کی۔ مغلیہ دور میں تو چھوٹی تصویریں بنانے کا رواج اپنے انتہائی عروج پر تھا ، اور اس کے مشہور مراکز میں سے ایک لاہور بھی تھا۔ عہد مغلیہ کے زوال کے بعد اور سکھوں کے دور میں یہ فن لاہور

اور پنجاب کے پہاڑی علاقوں میں سمٹ کر رہ گیا۔ موجودہ دور میں بھی کئی فنکار اس فن کو زندہ کرنے میں کوشاں ہیں۔ اس سلسلے میں عبدالرحمٰن چغتائی (مرحوم) کی کاوشوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دیگر چھوٹے فنون مثلاً زیورات سازی، سکہ سازی، اور قیمتی و نیم قیمتی پتھروں کے زیورات بنانے میں ہمارے فن کار ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ٹیکسلا، لاہور، حیدر آباد اور کراچی کے عجائب گھروں میں رکھے ہوئے زیورات اور مہریں ان کے فن کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔

پاکستان کے مختلف علاقوں میں لکڑی پر کندہ کاری کا کام قدیم زمانے سے اب تک مشہور ہے۔ اس فن کے مشہور مراکز ہالہ، کشمور، ملتان، جھنگ، بھیرہ، پشاور، سوات، دیر اور کشمیر ہیں۔ اس کے علاوہ فرنیچر پر کندہ کاری، پچی کاری اور لاکھ کا کام آج بھی ترقی کر رہا ہے۔

دستکاریاں: دستکاریوں کا ہنر پاکستانیوں کو ہزارہا سال کے ورثے میں ملا ہے۔ پاکستان کے دستکار نہایت ماہر، چابک دست اور جمالیاتی ذوق کے حامل ہیں۔ زیادہ تر دست کاریوں کا ہنر نسل بعد نسل ایک ہی خاندان کے افراد کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ دست کاریوں کا زیادہ تر کام عورتیں کرتی ہیں۔ کچھ دست کاریاں مرد اور عورتیں مل کر تیار کرتے ہیں۔ دست کاریوں میں قدیم ترین، مٹی کے ظروف اور چھوٹی چھوٹی مورتیاں (گھوگھو گھوڑے) بنانا ہے۔ یہ فن کم از کم آٹھ دس ہزار سال پرانا ہے۔ مسلمانوں نے اس فن میں یہ اضافہ کیا کہ رنگ دار ظروف کے ساتھ ساتھ روغنی ٹائلیں بنانے کے ہنر کو عروج پر پہنچایا۔ آج کل روغنی ظروف بنانے کا فن صرف ہالہ (سندھ) اور ملتان (پنجاب) تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ مغل دور میں یہ ہنر زیادہ تر پنجاب اور سندھ تک محدود رہا۔ عام مٹی کے ظروف کے لیے گجرات (پنجاب) شہرت دوام حاصل کر چکا ہے اور آج اسی علاقے میں چینی ظروف کے بیشتر کارخانے کام کر رہے ہیں۔

پیتل، تانبے اور کانسی کے برتنوں پر کندہ کاری کا کام ہمیشہ کی طرح

اب بھی پشاور میں بہترین ہوتا ہے ۔ خوب صورت زیور بنانے کا فن بھی اہل پاکستان کو ورثے میں ملا ہے ۔ کبھی ٹیکسلا سونے اور چاندی کے زیورات کے لیے بہت مشہور تھا اور اس کے عجائب گھر میں رکھے ہوئے کئی ہزار سال پرانے زیورات اہل ذوق کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں ۔ آج کل تقریباً ہر بڑے شہر میں نازک سے نازک اور اعلیٰ زیورات بنانے والے موجود ہیں ۔ چاندی کے زیور بنانے میں آج بھی پشاور ، ملتان ، بہاولپور اور حیدر آباد کے سنار بڑے ماہر مانے جاتے ہیں ۔

قالین بافی کا فن بھی ہمارے ہاں قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے ۔ مغلیہ دور میں لاہور کی قالین بافی کی فیکٹری دنیا بھر میں مشہور تھی ۔ پنجاب اور بلوچستان میں آج بھی یہ ہنر زندہ و تابندہ ہے ۔ سندھ اور ریگستان کے لوگ بکری کے بالوں سے قالین بناتے ہیں ۔ کشمیری لوگ روائتی نمدے بنانے میں ماہر ہیں اور اہل سرحد افغانی طرز کے قالینوں اور غالیچوں کو پسند کرتے ہیں ۔

اہل پاکستان کو جو دیگر ہنر ورثہ میں ملے ، ان میں کشیدہ کاری ، سوزن کاری ، پیچ ورک کے ہنر بھی شامل ہیں ۔ بلوچستان اور سندھ کی خواتین اپنی قمیصوں ، دوپٹوں ، اوڑھنیوں ، گدوں اور سرہانوں کے غلافوں پر یہ کام بڑی مہارت ، صفائی اور خوب صورتی سے کرتی ہیں ۔ ڈیزائینوں کے چناؤ اور رنگوں کے انتخاب ، بنانے والوں کے اعلیٰ ذوق کا اظہار کرتے ہیں ۔ پھلکاری اہل پنجاب اور سرحد کے بعض علاقوں کا ایک قدیم ہنر ہے ۔ اس میں کھدر کی چادر پر خالص ریشم کے دھاگوں سے کڑھائی کا کام بڑی خوب صورتی اور معیار سے کیا جاتا ہے ۔ ہزارہ اور سوات کے علاقوں میں یہ کام اب بھی مقبول ہے ۔ کشمیری شالوں پر کشیدہ کاری کا کام صدیوں سے کشمیری مسلمانوں کا طرہ کمال رہا ہے ۔ قیام پاکستان کے بعد بھی بہت سے کشمیری ہنر مند اس فن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں ۔ اسی طرح ملتان میں اونٹ کی کھال پر کام ، سرحد کی کڑھائی والی کرتیاں ، سندھ ، پنجاب اور سرحد میں ہاتھ سے چھپائی والے کپڑے ، چنیوٹ میں لکڑی کے فرنیچر پر کندہ کاری اور کشمیر اور ڈیرہ اسماعیل خان میں لاکھ

کا کام وغیرہ ۔ الغرض پاکستان مختلف دست کاریوں کا گہوارہ ہے اور لوگ ایسے ایسے خوب صورت دست کاری کے نمونے بناتے ہیں کہ وہ لوگوں کا دل موہ لیتے ہیں ۔ دست کاریوں کے بین الاقوامی میلوں میں پاکستان کی دست کاریاں خاص توجہ کا مرکز بنتی ہیں ۔

کھیل تماشے اور میلے : کھیل تماشے اور میلے ٹھیلے پاکستانی تہذیب و ثقافت کا ایک اہم حصہ ہیں ۔ ملک کے ہر حصے میں میلے یا تہوار ، موسموں اور فصلوں کے حساب سے یا بزرگانِ دین کے عرس کے موقعوں پر لگتے ہیں ۔ ان میلوں میں ملکی ثقافت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے ۔ دور دور سے لوگ خوبصورت مگر سادہ لباس پہن کر دنیا کے غم بھول کر ان میلوں میں شامل ہوتے ہیں ۔ عام دنوں کے علاوہ ان میلوں ٹھیلوں میں بھی کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں اور جیتنے والوں کو انعامات دیے جاتے ہیں ۔

پاکستان میں بہت سی روائیتی کھیلیں کھیلی جاتی ہیں ۔ ان میں کشتی ، کبڈی ، خاصے مقبول ہیں ۔ سندھ میں ملا کھڑا عوامی کھیل سمجھا جاتا ہے ۔ یہ ملھہ کھیلنے کا خاص انداز ہے ۔ ہاکی قدیم اور مقبول کھیل ہے ۔ پاکستان کی ہاکی ٹیم دنیا کی مشہور ٹیموں میں شمار ہوتی ہے ۔ فٹ بال اور والی بال قریباً ہر گاؤں اور قصبے میں کھیلے جاتے ہیں ۔ سکوائش میں پاکستان ہمیشہ دنیا بھر میں سرفہرست رہا ہے ۔ اسی طرح پاکستان کی کرکٹ کی ٹیم کا دنیا کی مشہور ٹیموں میں شمار ہوتا ہے ۔ ہاکی ، کرکٹ ، سکوائش میں پاکستان نے بہت سے نامور کھلاڑی پیدا کیے ہیں ۔

شادی اور بیاہ کی رسمیں : شادی اور بیاہ کی رسموں کے سلسلے میں پاکستانی ثقافت اپنے اندر ایک اچھوتے پن کی حامل ہے ۔ اس پر اسلامی رنگ صاف نظر آتا ہے ۔ اسلام میں شادی کا آغاز نکاح جیسی پاکیزہ رسم سے ہوتا ہے ۔ اسلام میں نکاح ایک عبادت کا درجہ رکھتی ہے ۔ ملک کے ہر حصے میں اس خوشی کے موقع پر لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق خوشی مناتے ہیں ۔

پُرتکلف کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔ لوگ بالخصوص بچے اور خواتین خوش نما رنگوں والے زرق برق لباس زیب تن کرتے ہیں ۔ خوب چہل پہل ہوتی ہے یہاں تک کہ شادی والے گھر کی طرف سے گزرنے والے شخص کو بغیر پوچھے یا بتائے علم ہو جاتا ہے کہ یہاں شادی کی تقریب ہو رہی ہے ۔

اسلام نے تو شادی جیسے خوشی کے موقع پر بھی انتہائی سادگی اپنانے کا درس دیا ہے مگر اس خطے کے لوگوں پر دیگر قوموں کی رسمیں بھی کسی قدر اثر انداز ہوئی ہیں جس کے نتیجے میں بعض ایسی رسمیں بھی جگہ پا چکی ہیں جنھیں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے ، مثلاً جہیز کی نمائش ، ڈھول وغیرہ کا بجانا ۔ البتہ اب معاشرے کے افراد انفرادی اور اجتماعی طور پر نیز حکومتی سطح پر بھی کوشش جاری ہے کہ ان قبیح رسموں سے چھٹکارا حاصل کیا جائے ۔ جہیز کے سلسلے میں تو آرڈیننس بھی جاری ہو چکا ہے ۔

شادی کے اخراجات کے سلسلے میں ہاتھ بٹانے کی غرض سے سلامی اور نیوتا وغیرہ کی رسم بھی رائج ہے ۔

پیدائش اور اموات کی رسمیں : پیدائش کے وقت مٹھائی وغیرہ کی تقسیم کرکے خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق نو مولود کے کانوں میں اذان دی جاتی ہے تاکہ شروع ہی سے اس کے دماغ پر کندہ ہو جائے کہ اللہ واحد و یگانہ ہے اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، اللہ کے رسول ہیں ۔ دوسرے لوگ بمعہ عزیز و اقارب اس خوشی کے موقع پر مبارک باد کہنے کے لیے اس گھر جاتے ہیں ، جہاں بچہ پیدا ہوا ہو ۔ بیشتر لوگ نومولود کو کچھ روپے یا دیگر تحائف بھی دیتے ہیں ۔

اگر کسی کے ہاں کوئی فوت ہو جائے تو اس صورت میں بھی ایک خاص طریق کار اپنایا جاتا ہے ۔ تمام عزیز و اقارب اور محلے دار غم میں شریک ہوتے ہیں ۔ تجہیز و تکفین کے انتظامات اکثر و بیشتر عزیز و اقارب ہی کرتے ہیں ۔ گھر والوں اور دور سے آئے ہوئے مہمانوں کی خوراک کا انتظام بھی عزیز ہی کرتے ہیں ۔ اس طرح لوگوں کا آپس میں میل جول اور تعاون بڑھتا ہے ۔ جس قدر

زیادہ ممکن ہو لوگ جنازے میں شریک ہوتے ہیں۔ بعد میں بھی لوگ غم میں شرکت کے اظہار کے لیے غمزدہ گھرانے میں جا کر افسوس کرتے ہیں اور ہر طرح کی امداد اور تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ اس سے معاشرے میں بہتر تعلق پیدا ہونے کا امکان بڑھتا ہے۔

سوالات

(الف) جامع جواب دیں:

(1) کلچر سے کیا مراد ہے؟ کلچر کس طرح تمام ارادی و غیر ارادی افعال کا مظہر ہوتا ہے؟

(2) کسی قوم کی شناخت اس کا کلچر ہوتا ہے، واضح کریں۔

(3) وادیٔ سندھ کی تہذیب کے خدو خال پر مختصر مگر جامع نوٹ لکھیں۔

(4) گندھارا آرٹ کن تہذیبی اثرات کے نتیجے میں پیدا ہوا، اس کے انداز و آہنگ کو واضح کریں۔

(5) پاکستانی ثقافتی ورثہ کیا ہے، تاریخی ارتقا کی روشنی میں واضح کریں۔

(6) مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیں:

جنوبی ایشیا میں مسلم عہد حکومت کے دوران۔ (i) فن تعمیر (ii) مصوری (iii) موسیقی (iv) خطاطی۔

(7) سامراجی نظام کیا ہوتا ہے۔ انگریزوں نے کس طرح جنوبی ایشیا میں مقامی شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا۔

(8) جنوبی ایشیا میں اسلامی ثقافت کیونکر ہندو ثقافت سے مختلف ہے۔

(9) پاکستانی کلچر کے خدو خال کا تفصیل سے جائزہ لیں ۔

(ب) درست کے آگے ✓ کا نشان لگائیں :

(i) کسی بھی گروہ کا کلچر اس کے ارادی افعال کا مظہر ہوتا ہے ۔

(ii) پہاڑوں کے دامن میں تہذیب انسانی کی سحر نمودار ہوئی ۔

(iii) وادیٔ سندھ کی تہذیب ، ایرانی اور یونانی تہذیب کی ہم عصر تھی ۔

(iv) وادیٔ سندھ کی تہذیب کا پتہ موئن جودڑو اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ سے لگتا ہے ۔

(v) وادیٔ سندھ کی تہذیب شہری تھی ۔

(vi) وادیٔ سندھ کی تہذیب کے باسی تانبے کے استعمال سے ناواقف تھے ۔

(vii) وادیٔ سندھ کی تہذیب کے رہنے والے افغانستان سے جواہرات ، ترکستان سے تانبہ اور خراسان سے لوہا درآمد کرتے تھے ۔

(viii) وادیٔ سندھ کی تہذیب کے لوگ جنگجو تھے ۔

(ix) ہندی ، ایرانی اور یونانی تہذیبوں نے مل کر گندھارا آرٹ کو جنم دیا ۔

(x) گندھارا آرٹ کا ثقافتی مرکز پشاور تھا ۔

(ج) مختصر جواب دیں :

(i) مسلمان ، جنوبی ایشیا میں کب فاتح کی حیثیت سے آئے ۔

(ii) فن تعمیر میں کشادگی ، صحیح محراب اور صحیح گنبد بنانے کی ابتدا کس نے کی ۔

(iii) جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ پانچ عمارات کا نام لکھیں ۔

(iv) مسجد وزیر خاں کس قسم کی کاشی کاری کے لیے مشہور ہے -
(v) ہمایوں ، ایران سے واپسی پر کن مصوروں کو ساتھ لایا -
(vi) جہانگیر کے دور میں کس قسم کی مصوری کو عروج ملا -
(vii) مسلم عہد کا اولین موسیقار کون تھا -
(viii) ہندو انتہا پسند تحریکیں کا مسلمانوں کے خلاف کیا کرنا چاہتی تھیں -
(ix) علامہ اقبال نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں بالخصوص اور اُمت مسلمہ کے لیے کیا پیغام دیا -
(x) قائداعظم نے قیام پاکستان کا اولین مقصد کیا فرمایا -
(xi) پاکستانی کلچر ایک مخلوط کلچر ہے ؟ مختصر جواب دیں -
(xii) پاکستانی ثقافت کی بنیاد اسلام ہے ، مختصر طور پر واضح کریں -
(xiii) پاکستانی فنون کیا ہیں -



پاکستانی زبانیں

زبان مافی الضمیر کے اظہار کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اس سے ہم اپنے خیالات اور احساسات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ زبان کی موجودہ شکل ایک طویل شعوری اور لاشعوری محنت کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں انسان محض آواز کے سہارے اپنے جذبات اور احساسات دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان آوازوں نے مختلف الفاظ کا روپ دھار لیا۔ اس طرح الفاظ اور ان کے استعمال سے زبان ایک اہم ذریعۂ اظہار بن گئی۔

جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا ہے کہ انسان نے ابتدا میں زبان کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے استعمال کیا، لیکن بعد ازاں معاشرتی، معاشی، طبیعی اور مذہبی ضرورتوں کے پیش نظر اس میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ یوں ہر معاشرے اور علاقے کی زبان اپنے مخصوص انداز میں ڈھلتی گئی۔ اس طرح مختلف علاقائی زبانوں اور بولیوں کا جنم ہوا۔

معاشرتی ضرورتوں اور انسان کے شعوری و لاشعوری محسوسات میں ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کے استعمال میں اضافہ ہوتا گیا اور الفاظ میں قوت پیدا ہوتی رہی۔ زبان کے ارتقاء میں اس مرحلے پر ادب نے جنم لیا۔ اس کا ابتدائی روپ ''لوک ادب'' کہلاتا ہے۔ اس قسم کے ادب میں وہاں کے بولنے والوں کے مزاج، ثقافتی پس منظر اور احساسات کی عکاسی ہوتی ہے۔ جب اس قسم کا ادب اظہار کا مؤثر وسیلہ بن جاتا ہے، نیز زبانوں کے پاس ذخیرہ الفاظ میں

خاصا اضافہ ہو جاتا ہے ، تب معاشرہ شعوری اور لاشعوری کیفیات کے اظہار کے لیے "معیاری ادب" تخلیق کرتا ہے - کوئی زبان جتنی زیادہ قدیم ہوگی ، اس میں اتنا ہی ذخیرہ الفاظ زیادہ ہوگا اور وہ اپنے معاشرے کی وہاں کے ادب کے حوالے سے ، نمائندگی کی مکمل صلاحیت رکھتی ہوگی -

پاکستان ایک ایسے خطۂ زمین پر واقع ہے جہاں اسے کئی قسم کے قدیم تہذیبی ورثے ملے ہیں ، جو اپنے خد و خال اور معاشرتی اقدار کے لحاظ سے مختلف ادبوں کے مالک ہیں -

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے - اس کے علاوہ چھوٹی بڑی تیس کے قریب زبانیں بولی جاتی ہیں - ان میں اہم سندھی ، پنجابی ، بلوچی ، کشمیری اور براہوی ہیں -

اُردو

مختلف زبانوں کے ہونے کے باوجود پاکستان کے لوگ جہاں ایک مذہب کے تار میں پروئے ہوئے ہیں ، وہاں ایک اور رشتہ زبان کا بھی ہے - زبان کا یہ رشتہ یہاں کی مختلف زبانوں کے اشتراک سے پیدا ہوا ، جسے اُردو کے نام سے پہچانا جاتا ہے - اُردو جہاں رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی ہے ، وہاں یہ قومی تشخص کی علامت بھی ہے -

اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے - اس کے معنی "لشکر" کے ہیں - جب جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی حکومت مضبوط ہوئی تو انھوں نے اپنے لشکروں میں مختلف علاقوں کے لوگ بھرتی کیے - ان میں عرب ، ایرانی ، ترک ، ہندوستانی ، پنجابی ، پٹھان ، بنگالی اور بلوچی وغیرہ شامل تھے - ظاہر ہے یہ لوگ مختلف زبانیں بولتے تھے - ان کے میل جول سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی - چونکہ یہ زبان لشکر سے وابستہ لوگ بولا کرتے تھے ، اس لیے اسے اُردو کا نام دیا گیا -

اُردو نے مختلف ادوار میں اپنے کئی نام تبدیل کیے - شروع میں اسے

ہندوی ، ہندی اور ہندوستانی کہا جاتا تھا ۔ بعد ازاں یہ ریختہ بنی ۔ اس کے بعد اردوئے معلٰی اور اب صرف اُردو کے نام سے موسوم ہے ۔

مختلف ادوار میں اپنے ناموں کی طرح اس کا ادبی آہنگ بھی بدلتا رہا مثلاً امیر خسرو (وفات 1325ء) کو ہندی یا ہندوی کا قدم شاعر گردانا جاتا ہے ۔ ریختہ کے دور میں مصحفی ، اردوئے معلٰی کے دور میں غالب ، ذوق وغیرہ مشہور ہیں ۔

1647ء میں جب آگرہ کی بجائے شاہ جہاں نے دہلی کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو دہلی کے ایک ہی بازار میں لشکری اور خواص رہتے تھے ۔ بادشاہ نے اس بازار کو اردوئے معلٰی کا خطاب دیا لہٰذا وہاں بولی جانے والی زبان کو بھی اسی نسبت سے اردوئے معلٰی یا زبانِ دہلوی کہا جانے لگا ۔ جب یہ زبان دکن اور گجرات پہنچی تو اسے دکنی اور گجراتی بھی کہا جانے لگا ۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر امرا نے اس کی ترقی کے لیے مواقع پیدا کیے ۔ اس طرح یہ بول چال کی سطح سے بلند ہو کر بہت جلد ادبی درجہ تک جا پہنچی ۔

اُردو غزل کا پہلا دیوان سلطان محمد قلی قطب شاہ والئی گولکنڈہ نے مرتب کیا ۔ دکن ہی کے ولی دکنی کا شمار اُردو کے ابتدائی شعرا میں ہوتا ہے ۔ جن شعرا نے اُردو ادب کا دامن وسیع تر کیا ان میں آرزو لکھنوی ، سودا ، میر تقی میر اور درد شامل ہیں ۔ دہلی اور دکن کے علاوہ اردو کی مقبولیت ریاست اودھ اور لکھنؤ میں بڑھی ۔ اس سرزمین میں غزل کے ساتھ ساتھ مرثیہ گوئی کے فن کو فروغ حاصل ہوا اور انیس و دبیر جیسے بلند گو شعرا اردو کو نصیب ہوئے ۔

انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں نظم کے ساتھ ساتھ اُردو نثر کو بھی ترقی ملی ۔ اس دور میں ذوق ، بہادر شاہ ظفر اور مرزا غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر پیدا ہوئے ۔ غالب کی غزل کے ساتھ ساتھ ان کی نثر بھی اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے ۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جنوبی ایشیا میں سیاسی اور معاشرتی حالات بدل گئے ۔ ان بدلتے حالات میں اُردو زبان میں تخلیقات نے ایک نیا رخ لیا

سرسید احمد خاں نے علی گڑھ کالج قائم کیا جس میں معاشرتی ترقی کے ساتھ ساتھ اُردو ادب اور نثر نے نمایاں ترقی حاصل کی ۔ سرسید اور ان کے رفقا نے اُردو نظم اور نثر ، ہر دو میں نئے تجربات کیے اور اُردو کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا ۔ اس دور میں قومی درد بحیثیت مجموعی پیدا ہوا ۔ اسی زمانے میں مولانا حالی نے مسدّس لکھی اور مسلمان قوم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اپنے عظیم ورثے کا احساس دلایا مولانا شبلی نے اسلامی تاریخ کو ایک نئے انداز میں پیش کیا اور مغربی مستشرقین کے اعتراضات کا ٹھوس جواب دیا ۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے فلسفے اور شاعری کا سورج اس کے بعد طلوع ہوتا ہے ۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے پورے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو یہ بات سمجھانا چاہی کہ مسلمان عظیم ثقافتی ، تمدنی اور نظریاتی ورثے کے حامل ہیں ۔ اب ان پر جو افتاد پڑی ہے ، اس کا صرف یہی حل ہے کہ وہ اپنی خودی کو مضبوط کرکے نئے حالات کا مقابلہ کریں ۔ اس کے علاوہ ان کو یہ خیال تھا کہ مسلمان دُنیا میں جہاں کہیں بھی ہیں ، وہ ایک باہمی رشتے میں منسلک ہیں اور اس طرح ان کی حیثیت ایک اُمت واحدہ جیسی ہے ۔ ان کو چاہیے کہ وہ باہم مجتمع ہو کر تمام مہذب طاقتوں کا مقابلہ کریں ۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری اُردو اور فارسی دونوں میں کی ۔ ان کی شاعری عوام میں اتنی مقبول تھی کہ لوگوں کو ان کی طویل نظمیں بھی ازبر ہوتی تھیں ۔

علامہ اقبال کے بعد جدید ادب کے زیر اثر اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا ۔ اس میں عقلیت پسندی کو فروغ حاصل ہوا ۔ یوں عوام کے جذبات کی عکاسی کرنے والا ادب پروان چڑھا ۔ اس تحریک کے زیر اثر افسانہ اور شاعری میں جن ادبا نے نئے اسلوب اپنائے ، ان میں منشی پریم چند اور بعض دیگر جدید دور کے ادیب شامل ہیں ۔

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو ادب کی ترقی میں ایک آزاد فضا پیدا ہوئی جس میں مختلف ادیبوں نے اپنے اپنے اصناف سخن میں نمایاں کام کیے ۔ ان میں اُردو شاعری ، اُردو ناول نگاری ، ڈرامہ نویسی ، افسانہ نویسی اور تحقیق و

تنقید سرفہرست ہیں ۔

پشتو

پشتو صوبہ سرحد کی زبان ہے ۔ اس کے بولنے والوں کو پشتون یا پختون کہا جاتا ہے ۔ اس زبان کی ابتداء تقریباً 5 ہزار سال قبل افغانستان کے علاقے باختر یا بخت میں ہوئی تھی ۔ اس نسبت سے اس کو باختو یا پختو کا نام دیا گیا جو بعد میں پختو یا پشتو بن گیا ۔

پشتو اگرچہ ایک قدیم زبان ہے لیکن پشتو ادب کا آغاز بہت بعد میں ہوا ۔ اس کا ادب بھی دوسری مہذب زبانوں کی طرح شاعری سے شروع ہوا ۔ ایک تحقیق کے مطابق پہلی کتاب آٹھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں لکھی گئی جس کا نام پٹہ فزانہ ہے ۔ نظم کا پہلا شاعر امیر کروڑ کو سمجھا جاتا ہے ۔

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر تک پشتو ادب بیرونی اثرات قبول کر چکا تھا ۔ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی تراکیب شامل ہونا شروع ہو گئی تھیں ۔

انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں میں نظم کے ساتھ ساتھ قصیدہ اور مرثیہ بھی پشتو کی خاص اصناف گردانی جاتی تھیں ۔ غیاث الدین بلبن (1265ء تا 1290ء) اور شیر شاہ سوری (1540ء تا 1545ء) کے دور میں قصیدہ اور مدح کی اصناف بھی پشتو ادب کا حصہ بنیں ۔

محققین کو تذکرۃ الاولیا نام کی ایک قدیم تصنیف ملی ہے ، جس میں شعرا نے حمد و نعت کی اصناف پر بھی طبع آزمائی کی تھی ۔ یہ کتاب 1200ء کی ہے ۔ محمود غزنوی کے دور میں سیف اللہ نامی ایک شخص نے باقاعدہ طور پر پشتو کے حروف تہجی تیار کیے جو آج تک رائج ہیں ۔ پشتو شاعری میں جو موضوعات نمایاں طور پر ملتے ہیں ، ان میں حریت ، غیرت ، جنگ وغیرہ خاص طور سے نمایاں ہیں ۔ تصوّف کا تذکرہ بھی ملتا ہے ، ملاّ مست اس اسلوب کے پیشوا مانے جاتے ہیں ۔

خوشحال خان خٹک (1613ء تا 1691ء) پشتو کے عظیم شاعر ہیں۔ یہ صاحبِ قلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ سیف بھی تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے "خوشحال کے لیے وہ لمحات قابل مسرت ہیں۔ جب تلوار اور زرہوں کی جھنکار ہوتی ہے"۔ خوشحال خان نے اپنی شاعری میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق لکھا۔ ان میں عشق حقیقی، عشق مجازی، جنگ، بزم، تصوف، اخلاق، حریت اور بہادری خاص طور سے نمایاں ہیں۔

پشتو ادب کے دوسرے بڑے شاعر رحمان بابا ہیں۔ یہ فقیرصفت شاعر ہمیشہ عشق و تصوف میں غرق رہتے تھے اور یہی ان کی شاعری کے موضوع بھی تھے۔ ان کے نزدیک عشق ہی کائنات کی تخلیق کا باعث ہے۔ رحمان بابا کو پشتون معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کا انداز پشتو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی چھاپ بعد میں آنے والے شعرا پر عیاں ہے۔

لوک گیت، پشتو ادب کا ایک بے نظیر سرمایہ ہیں۔ اس کی کئی اصناف ہیں، مگر ٹپہ، ٹپہ، نصکئی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ بعض شعرا نے لوک گیتوں کی مختلف اصناف کو اپنی شاعری کا بھی موضوع بنایا ہے۔ ان شعرا میں نور دین اور ملا مقصود وغیرہ شامل ہیں۔

پشتو نثری ادب نے بیسویں صدی میں ترقی کرنا شروع کی۔ جدید تعلیم کے زیراثر نئے نظریات اور خیالات کے حامل اہلِ قلم نے پشتو لغات، گرامر نویسی، سوانح، افسانہ نویسی، ناول اور ڈرامے میں نمایاں کام کیا۔

پشتو زبان کے تین لہجے ہیں۔ ایک لہجہ شمال مشرق کے علاقوں کا، دوسرا جنوب مغرب کے علاقوں کا اور تیسرا ازوی قبائل کا لہجہ ہے۔ ان تینوں کے مابین بنیادی طور پر صرف تلفظ کا فرق پایا جاتا ہے۔

سندھی

سندھی پاکستان کی ایک قدیم ترین زبان ہے۔ اس زبان پر دراوڑی،

سنسکرت ، یونانی ، ترکی ، ایرانی اور دیگر کئی زبانوں کا اثر نمایاں ہے ۔ انگریزوں کی آمد کے بعد انگریزی زبان کے بے شمار الفاظ سندھی میں شامل ہوئے۔ سندھی زبان کا ادب اور ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے اور یہ زبان اپنے قدیم ثقافتی ورثے کے باعث باقی زبانوں کی نسبت زیادہ پختہ ہے ۔

سندھی زبان ایک وسیع علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ اس وجہ سے اس کے کئی لہجے نظر آتے ہیں ۔ سندھ کے زیریں اور راجستھانی علاقے میں لاڑی، کچھی ، کاٹھیاواڑی اور تھری کی بولیاں رائج ہیں ۔ بلوچستان میں جوگالی ، گنداوی ، فکری ، لاسی ، کیچی ، لوری اور چیٹنی کے لہجے بولے جاتے ہیں ۔ جب کہ باقی علاقوں میں مستعمل بولیوں کو کوھستانی ، سرائیکی اور وچولی کہا جاتا ہے ۔ اس کا معیاری لہجہ (ساھتی) علمی ، ادبی اور صحافتی نگارشات میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے ۔

سندھی زبان اس علاقے میں اسلام کے آنے سے پہلے اتنی ترقی یافتہ نہ تھی ، البتہ سندھی میں لکھنے پڑھنے کا رواج عام تھا ۔ بعد ازاں مسلمانوں کے آنے کے بعد عربی کے ساتھ ساتھ اس کو بھی باقاعدہ طور پر اہمیت حاصل رہی اور پورے اسلامی دور میں مقامی زبانوں میں سندھی ہی واحد زبان تھی جس میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا گیا ۔ 1050ء سے 1350ء تک کے دور میں ادبی و دینی تخلیقات میں خاص طور سے کام کیا گیا ۔ یہ سندھ کی ادبی تاریخ کا ابتدائی دور تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اس میں حب الوطنی ، عزم ، خود داری ، روحانی عقائد کے موضوعات پر لکھا گیا ۔ اس دور میں ادب کی خاص اصناف قصے ، گنان ، بیت ، سورتھے ، گاتھا اور دوہڑے قابل ذکر ہیں ۔ گنان شاعری کا ایک منفرد انداز تھا جس میں اسماعیلی مبلغین اسلامی عقائد کی تبلیغ کیا کرتے تھے ۔ انھی مبلغین نے 40 حرفی رسم الخط بھی ایجاد کیا جسے میمنکی یا خوجکی خط کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ اس زمانے میں مختلف مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے صوفیہ کرامؒ نے بھی سندھی میں شاعری کر کے اسلام کی تبلیغ شروع کی ۔

اٹھارھویں صدی تک سندھی ادب میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست

جیسے عظیم شاعر اپنی بےنظیر شاعری سے سندھی ادب کو مالا مال کر چکے تھے ۔ اس دور کو سندھی ادب میں سنہری دور سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی (1689ء ۔ 1789ء) نے عام زندگی، اور غریب و محنت کش طبقے کی زندگی کے گن گائے اور اس میں انسانی عظمت کو اجاگر کیا ۔ انھوں نے شاعری کے لیے تمثیلی انداز اختیار کیا اور وہ اپنے کلام کو خاص موسیقی میں پیش کیا کرتے تھے ۔ اس کا بنیادی مواد وہ سندھ کی لوک کہانیوں سے لیتے تھے ۔ اسی وجہ سے سندھ کے ہر کونے میں ان کی شاعری کی گونج سنائی دیتی ہے ۔ 'شاہ جو رسالو' ان کی شاعری کا مجموعہ ہے ۔

اسی دور کے ایک عظیم المرتبت شاعر سچل سرمست ہیں ۔ انھوں نے ہندی، سندھی، اردو، سرائیکی، پنجابی اور فارسی میں شاعری کی ۔ وہ صوفی صفت انسان تھے اور تصوف میں وحدت الوجود ان کا مسلک تھا اور یہی ان کی شاعری کا معیار بھی ۔ وہ لوگوں کو توحید کا درس دیتے تھے اور مجموعی طور پر ان کے اشعار کی تعداد نو لاکھ کے قریب ہے ۔

شاعری کے ساتھ ساتھ نثری ادب میں بھی اساتذہ، علما اور مبلغین کی اجتماعی کوششوں سے بہت سا سرمایہ مجتمع ہوا ۔ اس سلسلے میں ابو الحسن سندھی کی کوششیں نمایاں ہیں ۔ انھوں نے سندھی کے لیے عربی رسم الخط کو بنیاد بنا کر ایک نیا رسم الخط تیار کیا ۔ اس سلسلے میں دوسرا نام مخدوم محمد ہاشم (1690ء تا 1761ء) کا آتا ہے ۔ وہ بہت بڑے عالمِ دین تھے ۔ انھوں نے فارسی اور سندھی میں تقریباً 150 کتابیں لکھیں جن کا موضوع اسلامی عقائد کی تصحیح و تشریح ہے ۔ ان میں سے بعض کو آج بھی دینی مدارس اور مصر کی جامعۃ الازہر میں نصابی کتب کی حیثیت حاصل ہے ۔

اس زمانے میں آخوند عزیز اللہ نے قرآن پاک کا نثری ترجمہ کیا ۔

انگریزوں کے آنے کے بعد سندھی زبان میں ہمہ رخ علمی اور ادبی سرمایے نے ترقی کی ۔ اس دور میں مرزا قلیچ بیگ (1855ء تا 1929ء) کا نام بہت اہم ہے انھوں نے شاعری کے موضوعات پر کتابیں لکھیں ۔ دنیا کی کئی زبانوں سے

اچھی اچھی کتب کے تراجم کیے - جغرافیہ ، تاریخ ، سوانح نویسی ، لغت نویسی ، گرامر نویسی ، تذکرہ نویسی ، ڈرامہ نگاری ، ناول نگاری اور تحقیق وغیرہ سمیت ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے - ان کی تصانیف کی تعداد 400 کے لگ بھگ ہے -

انگریزوں کے دام تسلّط میں برصغیر کی سیاسی اور سماجی زندگی میں بہت اہم تبدیلیاں آئیں اور لوگوں میں شعور پختہ ہوا - اسی دور میں سندھی صحافت کو اہمیت حاصل ہوئی اور اس کو فروغ حاصل ہوا -

جدید ادبی رجحانات میں سندھی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ متأثر ہوئی - قیام پاکستان کے بعد جدید افسانہ ، ڈرامہ نگاری ، ادبی تحقیق اور دوسرے علمی میدانوں میں خاصا کام ہوا - جدید ادبا نے روایتی انداز کو جدید رجحانات سے ہم آہنگ کیا ہے اور تمام تر نثری اصناف کو جلا بخشی ہے - تحقیق و تنقید میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے -

پنجابی

پنجابی ، پنجاب کی زبان ہے - اس زبان کا ربط اس علاقے کی قدیم تہذیب ہڑپائی یا دراوڑی سے ملتا ہے - تاریخی و جغرافیائی تبدیلیوں کے باعث اس کے چھوٹے بڑے لہجے یا بولیاں ہیں - ماجھی ، ملتانی یا سرائیکی ، پوٹھوہاری ، چھاچھی، دھنی اور شاہ پوری - ماجھی لہجہ معیاری لہجہ سمجھا جاتا ہے جو لاہور اور اس کے آس پاس کے علاقے میں مروج ہے -

پنجابی زبان کے علم و ادب کی نشاندہی محمود غزنوی کے زمانے سے ہوتی ہے - اس سلسلہ میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا نام آتا ہے - ان کی شاعری کا موضوع پیار و محبت ، تصوف اور حب الوطنی ہے - مجموعی طور پر پنجابی شاعری میں تصوف کے رموز کا بیان خاص طور سے پیش کیا جاتا ہے - ان میں شاہ حسین (مادھو لال حسین) ، سلطان باہو ، بلھے شاہ ، خواجہ فرید شامل ہیں - تصوف کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے معاشرتی و سیاسی حالات کا رنگ بھی ان پر غالب ہے اور اس کا اظہار خاص علامتوں میں نظر آتا ہے ، یہی وجہ ہے کہ

ان کا کلام عوام میں بے حد مقبول تھا۔

پنجابی شاعری میں داستان گوئی بھی ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ ان شعرا نے پنجاب کی لوک داستانوں کو نظم کیا۔ ان میں وارث شاہ کا قصہ ہیر رانجھا، ہاشم شاہ کا قصہ سسی پنوں، فضل شاہ کا قصہ سوہنی مہینوال اور حافظ بر خوردار کا قصہ مرزا صاحباں مشہور ہیں۔ ان قصوں میں اعلیٰ درجہ کی شاعری، اس وقت کے پنجاب کی تاریخی، معاشی، مذہبی اور معاشرتی زندگی کی بھر پور جھلک نظر آتی ہے۔

پنجابی ادب اپنے اظہار کے حوالے سے ایک بھر پور تصویر پیش کرتا ہے جس کی دنیا کے ادب میں نظیر نہیں ملتی۔ اس کے اصناف سخن کی تعداد زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے، جن میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی محسوسات تک کا اظہار کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ان میں وار، ڈھولے، ماہیا، دوہے، گھوڑی، سٹھنیاں، ٹپے، بولیاں وغیرہ شامل ہیں۔

بیسویں صدی سے پہلے پنجابی نثر میں بہت کم کام ہوا اور یہ صرف مذہبی علم تک محدود تھا۔ بعد ازاں ناول نویسی، ڈرامہ نویسی، تذکرہ نویسی تحقیق و تنقید اور دوسرے اصناف نثر میں مختلف لوگوں نے گرانقدر کام کیا ہے۔ اب ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی وجہ سے جدید ڈرامہ نویسی نے بڑی ترقی کی ہے۔

بلوچی

بلوچ اپنی معاشرت کے اعتبار سے بادیہ نشین ہیں۔ ان کی زبان بلوچی ہے جس کا تعلق آریائی زبانوں سے ہے۔ بلوچی زبان کے دو اہم لہجے ہیں: ایک سلیمانی اور دوسرا مکرانی۔

اگرچہ بلوچی رسم الخط پہلے ایجاد ہو چکا تھا، مگر قدیم بلوچی ادب تحریری صورت میں بہت دیر بعد میں آیا۔ مجموعی طور پر بلوچی شاعری کو 3 حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

بلوچی شاعری میں زیادہ اہم رزمیہ شاعری ہے۔ اس کے موضوعات میں ہمت، جاہ و جلال، غیرت، برد باری اور بہادری شامل ہیں۔ دوسرا حصہ

عشقیہ شاعری کا ہے ۔ اس میں حسن و عشق ، شباب اور دوسرے موضوعات ملتے ہیں ۔ تیسرا حصہ لوک داستانوں پر محیط ہے ۔ اس میں لوری اور موتک کی اصناف قدیم زمانے سے سماجی زندگی کا عکس پیش کرتی آئی ہیں ۔

بلوچی زبان کی قدیم شاعری کو روشناس کرانے کا کام 1840ء میں ایک انگریز مسٹر لیچ نے جاری کیا ۔ اس کے علاوہ گورٹیچ ، مسٹر ٹمپل اور مسٹر بروس کی انفرادی کوششیں بھی قابل ذکر ہیں ، جنھوں نے بلوچی ادب کے اہم پہلو اجاگر کیے ۔ بلوچی ادب میں میر چاکر خان ، حمل رند و منہاز ، پیرنگ و گران ناز شاہ حرید دھانی مشہور قصے ہیں ۔ انگریزوں کے دور میں جو بلوچی شاعری تخلیق کی گئی ، اس میں تصوف ، اخلاقیات اور انگریزوں کے خلاف نفرت کے عنوانات ملتے ہیں ۔ اس دور کا بلند پایہ شاعر مست توکلی ہے ۔

قیام پاکستان کے بعد اردو حرف تہجی کو گھٹا بڑھا کر بلوچی کے لیے ایک معیاری رسم الخط ایجاد کیا گیا ۔ 1960ء میں پہلا بلوچ مجلہ شائع کر کے بلوچی زبان میں صحافت اور ادب کو ایک نیا رخ ملا ۔ جدید ادب میں جملہ اصناف سخن پر مشق جاری ہے ۔

کشمیری

کشمیری زبان ایک تحقیق کے مطابق وادی سندھ کی زبانوں سے منسلک ہے ۔ اس کے کئی مشہور لہجے ہیں جن میں سلمانکی ، ہندکو ، گندورو ، گامی زیادہ مشہور ہیں ۔ معیاری و ادبی لہجہ گندورو کو سمجھا جاتا ہے ۔ کشمیری ادب کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

گیت سنگیت کا دور جس میں لوک گیتوں کی شکل میں اجتماعی احساسات کا اظہار کیا جاتا تھا ۔

شتی گنتھ کے دور میں الٰہیات کے موضوعات پر لکھا گیا ۔ اس دور میں مشہور شاعر بلکہ کشمیری کے پہلے شاعر شتی گنتھ تھے ۔

تیسرے دور میں عشق و محبت کے قصے لکھے گئے ۔ اس دور کی اہم شاعرہ

حبا خاتون ہیں۔

چوتھے دور میں کشمیری زبان و ادب پر روحانی اثر غالب رہا جس کے روحِ رواں محمود گامی تھے۔

پانچواں دور جدید ادب کے زیرِ سایہ پلا بڑھا۔ یہ اپنے اندر نئے فکری رجحانات رکھتا تھا۔ غلام احمد باجور کو اس دور میں اہم مقام حاصل ہے

کشمیری ادب میں مقامی تخلیقات کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں سے تراجم بھی ہوئے۔ ایرانی ادب کو، خاص طور پر غزل اور مثنوی کے تراجم کے بعد، کشمیری شاعری نے بھی اپنی تخلیقی صنف کے طور پر اپنا لیا۔

براہوی

وادی سندھ کی قدیم قوم دراوڑ کی زبان براہوی ہے۔ براہوی قبائل قدیم زمانے سے ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مستقل آبادی نہ ہونے پائی، البتہ اب اس قبیلے کے لوگ سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے علاقوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ساراوان، جھالاوان، کیچ اور مکران کے علاقوں میں ان کی آبادی گنجان ہے۔ اس کے دو واضح لہجے ملتے ہیں۔ مشرقی لہجہ، سندھی زبان کے قریب ترین ہے اور مغربی لہجہ پر بلوچی اثرات غالب ہیں۔

براہوی زبان کے اثرات قدیم ترین زمانوں سے ملتے ہیں مگر اٹھارھویں صدی عیسوی سے پہلے کوئی معیاری تحریر میسر نہیں۔ اس کے معیاری ادب کی ابتدا کے بعد جس ممتاز عالم و شاعر کا نام ملتا ہے، وہ ملک داد ہیں۔ ان کی کتاب تحفۃ العجائب کو معیاری مانا جاتا ہے۔

براہوی میں لوک ادب کا خزانہ بہت وسیع ہے۔ اس کی مشہور صنف لیلی مور ہے۔

اٹھارویں صدی میں انگریزوں کے خلاف تحریک میں تعلیم و تدریس کے لیے براہوی کو اپنایا گیا اور اس کے لیے پشتو رسم الخط سے مدد لی گئی۔ اس

دور میں علمی و ادبی میدان میں نمایاں کام کیا گیا ہے - اسی دور میں کلام پاک کا ترجمہ ہوا اور دیگر مذہبی موضوعات پر خاصا کام ہوا - قیام پاکستان کے بعد حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر براہوی ادب کی ترقی کے لیے بہت سے کام کیے گئے ہیں -

سوالات

(الف) جامع جوابات دیں :

1- زبان کی موجودہ شکل ایک طویل شعوری اور لاشعوری محنت کا نتیجہ ہے ، واضح کریں -

2- اُردو زبان کس طرح قومی تشخّص کی علامت بنتی ہے ؟

3- اُردو زبان کی مختصر تاریخ لکھیں اور اس کی ترقی میں مختلف عوامل کا جائزہ لیں -

4- پشتو زبان کی مختصر تاریخ لکھیں -

5- سندھی زبان پر مختلف اثرات اور اس میں مختلف لوگوں کی خدمات کا جائزہ لیں -

6- پنجابی زبان پر مختصر نوٹ لکھیں -

7- بلوچی زبان پر مختصر نوٹ لکھیں -

8- مندرجہ ذیل زبانوں میں ادب کا مختصر جائزہ پیش کریں :

(i) کشمیری (ii) براہوی

(ب) مختصر جواب دیں :

(i) لوک ادب کسے کہتے ہیں ؟

(ii) معیاری ادب کی تعریف کریں ؟

(iii) سرسید احمد خاں نے کون سا کالج قائم کیا ؟

(iv) تین کلاسیکی اُردو شعرا کے نام لکھیں ؟

(v) پشتو زبان کا پہلا شاعر کسے سمجھا جاتا ہے ؟

(vi) سندھی زبان پر کون کون سی زبانوں کا اثر نمایاں ہے ؟

(vii) 'شاہ جو رسالو' کس شاعر کا مجموعہ کلام ہے ؟

(viii) ابوالحسن نے کس زبان کے رسم الخط کو بنیاد بنا کر سندھی کا نیا رسم الخط تیار کیا ؟

(ix) پنجابی زبان کا تعلق کس قدیم تہذیب سے ملتا ہے ؟

(x) پنجابی زبان کے اہم لہجے بیان کریں ؟

(xi) پنجابی کے تین کلاسیکی شعرا کے نام لکھیں ؟

(xii) کس پنجابی شاعر کا قصہ ہیر رانجھا مشہور ہے ؟

(xiii) ہاشم شاہ کی کون سی کتاب مشہور ہوئی ؟

(xiv) بلوچی زبان کا تعلق کن زبانوں کے گروہ سے ہے ؟

(xv) بلوچی زبان کے دو اہم لہجے تحریر کریں ؟

(xvi) کشمیری زبان کے اہم لہجوں کے نام لکھیں ۔ اس کا معیاری لہجہ کون سا سمجھا جاتا ہے ؟

(xvii) براہوی زبان وادی سندھ کی کون سی قوم بولتی تھی ؟

(xviii) براہوی زبان کے دو واضح لہجوں کے نام لکھیں ؟



اقتصادی منصوبہ بندی اور ترقی

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ عوام کا معیارِ زندگی ترقی یافتہ ممالک کے باشندوں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ رہائشی، تعلیمی و طبی سہولتیں نا کافی ہیں۔ خواندگی کی شرح کم ہے۔ کم بچت اور پست سرمایہ کاری ترقی کی راہ میں اہم رکاوٹیں ہیں۔ آبادی کی افزائش کی شرح وسائل کی نسبت بلند ہے۔ غرضیکہ تیسری دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح پاکستان بھی ایک ترقی پذیر ملک ہے۔

پاکستان کے قدرتی و انسانی وسائل لاتعداد ہیں، لیکن ان وسائل کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں کئی معاشی، معاشرتی اور بین الاقوامی رکاوٹیں موجود ہیں، مثلاً قلیل آمدنی کی وجہ سے بچت کی صلاحیت پست ہے، یہی وجہ ہے کہ سرمایہ کاری کی سطح بھی پست ہے۔ مناسب معاشی ترقیاتی منصوبہ بندی کی مدد سے جملہ معاشی رکاوٹوں کا سدباب ہو سکتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے تجربے کی روشنی میں پاکستان بھی اب سائنسی و تکنیکی ترقی اور مناسب معاشی منصوبہ بندی کو بروئے کار لا کر اپنی جملہ معاشی و اقتصادی تنگیوں سے نجات حاصل کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ معاشی منصوبہ بندی کے ذریعے انسانی و مادی وسائل کا بہتر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نیز معاشی و سماجی بہبود کے مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

معاشی ترقیاتی منصوبے کا مقصد ملک کے باشندوں کو خوش حال اور

مطمئن زندگی گزارنے کے مواقع بہم پہنچانا ہوتا ہے ۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ملکی پیداوار میں اضافہ کرکے قومی آمدنی کو اس حد تک بڑھایا جائے کہ قومی آمدنی میں اضافے کی شرح افزائش آبادی کے مقابلے میں زیادہ ہو ۔ اس وقت پاکستان میں آبادی تقریباً 3 فی صد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال تقریباً 30 لاکھ نئے افراد کو خوراک ، لباس ، تعلیم ، صحت اور اسی قسم کی دیگر سہولتیں بہم پہنچانے کی ضرورت ہے ۔ پاکستان میں تمام ترقیاتی منصوبوں کا مقصد قومی آمدنی میں اس قدر اضافہ کرنا ہے کہ اگر موجودہ شرح افزائش آبادی قائم بھی رہے تب بھی ملکی مجموعی ترقی کا عمل رکنے نہ پائے ۔ یاد رہے کہ اگر افزائش آبادی کی شرح قومی آمدنی کی شرح سے زیادہ ہو تو فی کس آمدنی میں کمی واقع ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں معاشی ترقی کا عمل سست ہو سکتا ہے ۔ پاکستان کی معیشت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر توجہ اس امر کی طرف مبذول ہے تاکہ سائنسی و تکنیکی میدانوں میں فوقیت حاصل کرکے معاشی و اقتصادی ترقی کو تیز تر کیا جا سکے ۔ ساتواں پانچ سالہ منصوبہ (1988ء تا 1993ء) اس امر کی واضح عکاسی کرتا ہے ۔

ملکی معیشت ایک زندہ جسم کی مانند ہوتی ہے ۔ اس میں بہت سے شعبے مثلاً زراعت ، صنعت ، تجارت ، ذرائع نقل و حمل و رسائل ، کان کنی ، تعمیرات ، بجلی و گیس ، مکانات ، صفائی ، تعلیم وغیرہ شامل ہوتے ہیں ۔ معیشت مربوط طور پر ایک مشین کی طرح کام کرتی ہے ۔ ترقیاتی منصوبوں کے ذریعے مختلف شعبوں کو ایک خاص شرح سے اور مربوط انداز میں خاص سمت کی طرف ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ معیشت میں ایک خاص رفتار سے اضافہ ہو سکے ۔ مختلف شعبوں کے لیے ہدف (Targets) مقرر کیے جاتے ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لیے بامقصد و باضابطہ معاشی ترقیاتی منصوبے کے عمل کے تحت مالیاتی وسائل مہیا کیے جاتے ہیں ۔

معاشی ترقی ایک لمبا عمل ہے لہٰذا ماہرین کی رائے میں اسے ایک دو

سالوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا ۔ کسی زرعی ملک میں اگر کسی سال قدرتی موسم ساز گار ہونے کی وجہ سے زرعی پیداوار بڑھ جائے تو یہ قومی آمدنی میں محض وقتی اضافے کا باعث بنے گی ، کیونکہ آئندہ سالوں میں موسمی حالات غیر موافق بھی ہو سکتے ہیں ۔ معاشی ترقی تو بہرحال قومی آمدنی میں مسلسل ایک طویل عرصہ تک اضافے کی وجہ سے ہوگی ، اسی لیے ترقیاتی منصوبوں کی مدت عام طور پر پانچ سال رکھی جاتی ہے ۔ پاکستان کے تمام ترقیاتی منصوبوں کی مدت بھی پانچ سال ہے ۔ معاشی ترقی کو جانچنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے ، لہٰذا اس امر کے پیش نظر بعض اوقات ایک طویل المیعاد تناظری منصوبہ پیش کیا جاتا ہے جس کی مدت بیس سال تک ہو سکتی ہے ۔ اس بیس سالہ منصوبے کے دوران میں آنے والے پانچ سالہ منصوبے اس طویل المدت منصوبے کا حصہ ہوتے ہیں ۔

ترقی پذیر ممالک میں بالخصوص کئی معاشی پراجیکٹ لمبے عرصے کے ہوتے ہیں ، اس لیے ان کی تکمیل کے لیے مدت بھی طویل درکار ہوتی ہے لہٰذا ایسے طویل المیعاد منصوبے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جس میں پانچ سالہ منصوبوں کے نتائج کی لچک کو سمویا جا سکے ۔ اگر کسی پانچ سالہ منصوبے کے ہدف غیر موافق معاشی حالات کی وجہ سے پورے نہ ہو سکیں تو انہیں تناظری منصوبے میں ڈال دیا جاتا ہے تا کہ موافق حالات کے حامل منصوبے میں انہیں پورا کر دیا جائے ۔ اس طرح مطلوبہ شرح ترقی ممکن ہو سکتی ہے ۔ الغرض معاشی ترقیاتی منصوبہ بندی کا مقصد کسی ملک کی قومی آمدنی میں ایک طویل عرصہ تک اضافہ کرنا ہے تا کہ فی کس آمدنی بڑھنے کی بدولت لوگوں کی زندگی کا معیار بلند ہو اور ملک کے جملہ شعبہ جات میں مجموعی ترقی محسوس ہونے لگے ۔

قیامِ پاکستان کے وقت ملکی معیشت پسماندہ تھی ۔ عوام کے لیے جملہ سہولتوں کے مواقع محدود تھے ۔ کاشت کاری کے طریقے پرانے تھے ۔ زراعت میں مشینوں کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا ۔ صنعت برائے نام تھی ۔ بچتوں کو

جمع کر کے پیدا واری مقاصد میں لگانے کا منظم مالیاتی نظام موجود نہ تھا۔ نقل و حمل ، رسل و رسائل اور خبر رسانی کے ذرائع محدود تھے۔ پاکستان نے معاشی ترقی کے سفر کا آغاز انھی ناساعد حالات میں کیا۔

1955ء میں پاکستان میں پہلی مرتبہ جامع معاشی منصوبہ بندی کا آغاز کیا گیا۔ پہلا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ (1955ء تا 1960ء) تیار کیا گیا جس نے معاشی ترقی کے لیے ایک جامع اور مربوط پروگرام پیش کیا۔ اس منصوبے کے بنیادی مقاصد اور ان کے اہداف کے اہم نکات درج ذیل تھے :

(i) قومی آمدنی میں پندرہ فی صد اضافہ کرنا۔
(ii) فی کس آمدنی میں سات فی صد اضافہ کرنا۔ آبادی میں 1.4 فی صد سالانہ اضافے کی توقع تھی۔
(iii) بیس لاکھ نئے افراد کے لیے روزگار مہیا کرنا۔
(iv) برآمدات میں پندرہ فی صد اضافہ کرنا۔
(v) منصوبے کے اختتام تک ادائیگیوں کے توازن میں بیس کروڑ روپے کی بچت کرنا۔
(vi) اناج کی پیداوار میں 9 فی صد اضافہ کرنا۔
(vii) نقد فصلوں کی پیداوار میں اضافہ کرنا۔ چند ایک کی تفصیل یوں ہے۔ گنے میں تینتیس فی صد ، کپاس میں 21 فی صد ، پٹ سن میں 15 فی صد۔
(viii) دیہی زرعی و صنعتی ترقیاتی پروگرام کو دیہی آبادی کے ایک چوتھائی پر وسعت دینا تا کہ دیہی علاقوں میں زرعی و صنعتی پیداوار کے طریقوں کو بہتر بنایا جائے۔
(ix) صنعتی پیداوار میں ساٹھ فی صد اضافہ کرنا۔ صنعتوں میں سے پوزری، چینی ، کھاد ، سیمنٹ اور قدرتی گیس کو اہمیت دینا مقصود تھا۔
(x) سولہ لاکھ ایکڑ اراضی کو آبپاشی کی بہتر سہولتیں فراہم کرنا۔
(xi) بجلی کی پیداواری استعداد میں تین گنا اضافہ کرنا۔

(xii) پرائمری اسکولوں میں 10 لاکھ اور ثانوی اسکولوں میں قریباً ڈیڑھ لاکھ نئے بچوں کی تعلیم میں اضافہ کرنا اور کم از کم اسی قدر تعداد میں نئے بچوں کو تعلیم کی ترغیب دینا۔

(xiii) نجی بچتوں میں پانچ فی صد سے سات فی صد تک اضافہ کرنا۔

(xiv) اڑھائی لاکھ نئے مکان تعمیر کرنا۔

درج بالا مقاصد اور ہدف کو حاصل کرنے کی غرض سے دس ارب اسی کروڑ روپے خرچ کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اس میں سے ساڑھے سات ارب سرکاری شعبہ جات کے لیے اور تین ارب تیس کروڑ روپے نجی شعبے کے لیے مختص کیے گئے تھے۔

مقاصد کے اعتبار سے یہ منصوبہ نہایت اچھا تھا لیکن بوجوہ اس کے ہدف پورے طور پر حاصل نہ ہو سکے۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس منصوبے پر عمل درآمد تاخیر سے ہوا (1955ء کی بجائے 1957ء سے)۔ دیگر وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ ہوئی کہ اسی عرصے میں حکومت نے روپے کی بیرونی قدر کم کر دی جس سے منصوبے میں لگائے گئے تخمینے کسی حد تک ناقص ہو گئے۔ موسمی حالات کی خرابی اور سیم و تھور کی بنا پر زمین کی تباہی دیگر اہم وجوہات میں شامل ہیں۔

منصوبے کا جائزہ لینے سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں :

(i) قومی آمدنی میں 15 فی صد کی بجائے صرف 11 فی صد اضافہ ہوا۔

(ii) فی کس آمدنی 7 فی صد کی بجائے صرف 3 فی صد بڑھ سکی۔ اس سلسلے میں یہ نوٹ کرنا بھی ضروری ہے کہ آبادی میں اضافے کی شرح قریباً 1.6 فی صد سالانہ رہی۔

(iii) پانچ سال کے عرصے کے دوران میں جتنے افراد کام کرنے کے اہل ہوئے، ان میں سے پچاس فی صد سے بھی کم کو روزگار مہیا کیا جا سکا۔

(iv) زرمبادلہ کمانے کے ہدف کو بھی حاصل نہ کیا جا سکا کیونکہ اس

عرصے کے دوران میں برآمدات کو نہ بڑھایا جا سکا ، بلکہ اس کے برعکس درآمدات کی مقدار میں اضافہ ہو گیا ، یہی وجہ ہے کہ توازن ادائیگی خاصا خراب ہو گیا ، یہاں تک کہ پہلے چار سالوں کے دوران میں توازن ادائیگی میں 24 کروڑ روپے کا خسارہ واقع ہو گیا ۔

(v) اناج کی پیداوار میں نو فی صد اضافے کی بجائے صرف چار فی صد اضافہ ہو سکا ۔

(vi) موسمی حالات کی خرابی و بعض دیگر وجوہات کی بنا پر دیگر فصلوں کی پیداواری ہدف بھی حاصل نہ کی جا سکی ۔

(vii) اندرون ملک بچتوں کا جو ہدف مقرر کیا گیا تھا ، وہ بھی پورا نہ ہو سکا ۔ ملکی بچتوں کی شرح منفی 21 فی صد تک کم ہو گئی ۔

(viii) صنعتی میدان میں البتہ کئی صنعتیں قائم ہوئیں مثلاً کاغذ ، نیوز پرنٹ ، گتہ ، کھاد ، کیمیاوی اشیا سے متعلق صنعتیں وغیرہ ۔

درج بالا اعداد و شمار سے اندازا لگایا جا سکتا ہے کہ پہلا پانچ سالہ منصوبہ بیشتر میدانوں میں ناکام رہا ۔ اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے تجربات کی بدولت نئی سوچ اور انداز فکر نے جنم لیا جس سے آئندہ کے ترقیاتی منصوبہ جات کو تشکیل دینے میں مدد ملی ۔

دوسرا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ (1960ء تا 1965ء) پہلے منصوبہ کی مدت اختتام پر اپنایا گیا ۔ اس منصوبے کے بڑے بڑے مقاصد اور ان کے اہداف درج ذیل تھے :

(i) قومی آمدنی میں 24 فی صد اضافہ کرنا ۔

(ii) فی کس آمدنی میں 10 فی صد اضافہ کرنا ۔

(iii) 25 لاکھ نئے افراد کو روزگار کے مواقع فراہم کرنا ۔

(iv) زرعی پیداوار میں چودہ فی صد اضافہ کرنا ۔

(v) بڑی اور اوسط درجے کی صنعتوں کی پیداواری صلاحیت میں 14 فی صد تک اضافہ کرنا ۔

(vi) گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کو 25 فی صد تک بڑھانا۔
(vii) برآمدات میں سالانہ تین فی صد اضافہ کرنا۔

دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے مقاصد اور ہدف کو پورا کرنے کے لیے 23 ارب روپے کا تخمینہ لگایا گیا تھا۔ اس رقم میں سے بارہ ارب چالیس کروڑ روپے سرکاری شعبے، تین ارب اسی کروڑ روپے نیم سرکاری شعبے اور چھے ارب اسی کروڑ روپے نجی شعبے میں خرچ کرنے کا اندازا لگایا گیا تھا۔

باوجود اس بات کے کہ دوسرے ترقیاتی منصوبے میں بھاری صنعت کے قیام اور اس کی ترقی کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا گیا تھا نیز اس منصوبے کے لیے غیر ملکی سرمائے اور امداد پر انحصار کیا جانا تھا، اس منصوبے کے تحت ملک کی معاشی ترقی کی رفتار خاصی تسلی بخش رہی۔ بعض شعبوں میں تو ترقی اس حد سے بھی زیادہ ہوئی جو منصوبہ بناتے وقت قائم کی گئی تھی۔

منصوبے کا جائزہ لینے سے مندرجہ ذیل نکات توجہ کا مرکز بنتے ہیں:

(i) قومی آمدنی میں 30 فی صد سے بھی اضافہ ہوا۔
(ii) برآمدات میں سات فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوا۔
(iii) شعبہ صنعت میں 40 فی صد سے زیادہ ترقی ہوئی۔
(iv) زرعی شعبے میں ترقی 15 فی صد سے بھی زیادہ ہوئی۔
(v) روزگار کے مواقع متوقع حد تک نہ بڑھائے جا سکے، اس طرح اس شعبے کی ترقی کی رفتار غیر معیاری رہی۔

درج بالا جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دوسرا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ خاصی کامیابی سے ہم کنار ہوا، بلکہ کئی شعبوں میں تو ترقی مقررہ ہدف سے بھی بڑھ گئی۔ پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی میں دوسرے پانچ سالہ منصوبے کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس منصوبے کی تشکیل میں پہلے منصوبے کی خامیوں کو دور کیا گیا اور ملکی وسائل کا جائزہ لینے میں خاصی احتیاط سے کام لیا گیا۔ اس منصوبے کی کامیابی سے مزید حوصلہ افزائی ہوئی جو مستقبل کی منصوبہ بندی میں مد و معاون ثابت ہوئی۔

دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کی کامیابی کے بعد تیسرا پانچ سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ یہ ایک بیس سالہ تناظری منصوبے کا حصہ تھا جسے طویل المیعاد تناظری منصوبے (1965ء تا 1985ء) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بیس سالہ تناظری منصوبہ چار، پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں پر مشتمل تصور کیا گیا۔ اس تناظری منصوبے کے اہم ہدف قومی آمدنی میں چار گنا اضافہ کرنا، تمام افرادی قوت کو 1985ء تک روزگار فراہم کرنا، غیر ملکی امداد پر انحصار ختم کرنا، نیز ملک کے مختلف حصوں میں فی کس آمدنی کے تفاوت کو ختم کرنا شامل تھے۔

تیسرے منصوبے کے بڑے بڑے مقاصد اور ان کے اہداف درج ذیل تھے:

(i) ملکی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا اور قومی پیداوار میں 37 فی صد اضافہ کرنا۔

(ii) فی کس آمدنی میں 20 فی صد اضافہ کرنا۔

(iii) 55 لاکھ افراد کو روزگار فراہم کرنا۔

(iv) زرعی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا اور اس میں 5 فی صد سالانہ اضافہ کرنا۔

(v) صنعتی ترقی کی شرح 13 فی صد سالانہ تک بڑھانا۔

(vi) علاقائی تفاوت کو ختم کرنا۔

(vii) بنیادی صنعتوں کے قیام کو ترجیح دینا۔

(viii) زرمبادلہ میں اضافہ کرکے ادائیگیوں کے توازن میں استحکام پیدا کرنا۔

(ix) بنیادی سہولتوں میں اضافے کی سعی کرنا۔

(x) معاشرتی تحفظ مہیا کرنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے کل 52 ارب روپے مختص کیے گئے تھے۔ ان میں سے 30 ارب سرکاری شعبہ جات کے لیے اور 22 ارب نجی دائرے کے لیے وقف تھے۔

درج بالا مقاصد و کوائف سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیسرا پانچ سالہ منصوبہ

بہت سی خوبیوں کا حامل تھا مگر اس کی ترقی کا جائزہ لینے کے بعد جو تصویر سامنے آتی ہے ، اس کا خاکہ کچھ یوں ہے :

(i) زرعی ترقی کی رفتار متوقع رفتار سے کم رہی یعنی صرف 4.5 فی صد سالانہ ترقی ہو سکی ۔

(ii) برآمدات میں 9.5 فی صد اضافے کی توقع تھی مگر اس کے مقابلے میں یہ اضافہ صرف 7 فی صد رہا ۔

(iii) صنعتی میدان میں ترقی صرف 9 فی صد ہو سکی حالانکہ ہدف 13 فی صد کا تھا ۔

(iv) سرمایہ کاری کی شرح میں تقریباً 4 فی صد کمی ہو گئی ۔

مختصراً تیسرا پانچ سالہ منصوبہ پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکا اور بیشتر شعبوں میں مقرر کردہ ہدف تک نہ جا سکا ۔ دراصل ناساعد حالات نے ابتدا ہی سے تیسرے منصوبے کو گھیر لیا ۔ ابتدائی دو سالوں میں زبردست خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا جس سے فصلیں بری طرح متاثر ہوئیں ۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کی وجہ سے دفاعی اخراجات بڑھ گئے جس کی وجہ سے ترقیاتی اخراجات کے لیے مجوزہ وسائل میں کمی پیدا ہو گئی ۔ غیر ملکی امداد میں بھی 27 فی صد کمی کا سامنا کرنا پڑا ۔ زرعی ترقی میں کمی ہوئی ۔ اندرون ملک حالات ہنگاموں کی نذر ہو گئے جس نے صنعتی پیداوار پر برا اثر پڑا ۔ مختصراً تیسرے پانچ سالہ منصوبے کو مجوزہ حقیقی وسائل و سازگار حالات میسر نہ آ سکے جو معاشی ترقی کے پروگرام کے لیے درکار تھے ۔

چوتھا پانچ سالہ منصوبہ (1970ء تا 1975ء) بیس سالہ تناظری منصوبے (1965ء تا 1985ء) کی دوسری کڑی تھا ۔ اس منصوبے کے اہم بنیادی اغراض و مقاصد اور ہدف درج ذیل تھے :

(i) معاشی ترقی کی رفتار کو برقرار رکھنا یعنی قومی پیداوار میں 6.5 فی صد شرح سالانہ سے اضافہ کرنا ۔

(ii) 75 لاکھ نئے افراد کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنا ۔

(iii) ملک کے مختلف حصوں کے مابین فی کس آمدنی کے فرق کو کم کرنا۔
(iv) غذائی اجناس کی پیداوار میں 85 لاکھ ٹن کا اضافہ کرنا۔
(v) سماجی انصاف قائم کرنا یعنی قابل عمل پالیسیوں کی مدد سے معاشی ترقی اور سماجی انصاف میں ہم آہنگی پیدا کرنا۔
(vi) برآمدات میں ساڑھے آٹھ فی صد سالانہ اضافہ کرنا۔

ان مقاصد و اہداف کے حصول کے لیے 75 ارب روپے مختص کیے گئے تھے۔ ان میں سے 49 ارب سرکاری شعبہ جات کے لیے اور 26 ارب نجی شعبوں کے لیے رکھے گئے تھے۔

چوتھے پانچ سالہ منصوبے پر بوجہ پاک بھارت جنگ و دیگر اندرون ملک ناسازگار حالات عملدرآمد نہ ہو سکا اور اس منصوبے کو بالآخر منسوخ کرنا پڑا۔

ملک میں معاشی و سیاسی حالات کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے 1971ء تا 1978ء کے دوران میں سال بہ سال قلیل المیعاد منصوبہ بندی ہی کی جا سکی۔ ماہرین کی رائے میں اوسط المیعاد منصوبہ بندی عدم استحکام کی وجہ سے مشکل ہو جاتی ہے۔ قلیل المیعاد منصوبہ بندی کے ذریعہ سے طویل المیعاد پراجیکٹوں کی تکمیل مناسب انداز میں نہیں ہو پاتی۔ یک سالہ ترقیاتی منصوبوں سے عام طور پر مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر قلیل المیعاد منصوبہ بندی کی مدد سے معاشی ترقی کی رفتار کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا، لہٰذا متذکرہ عرصہ کے دوران میں خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔

پانچواں پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ (1978ء تا 1983ء) یکم جولائی 1978ء کو اپنایا گیا۔ اس منصوبے کے اہم مقاصد اور ان کے اہداف یہ تھے:

(i) قومی پیداوار میں اضافہ کرنا۔
(ii) زرعی و صنعتی شعبوں کی ترقی کی طرف توجہ کرنا۔
(iii) غذائی اجناس میں مکمل طور پر خود کفیل ہونا۔
(iv) دیہی علاقوں کی ترقی پر زور دینا اور وہاں جملہ معاشرتی خدمات فراہم کرنے کے سلسلے میں خاطر خواہ سعی کرنا۔ ان میں تعلیمی

اداروں و اسپتالوں کا قیام اور پینے کے پانی کی فراہمی شامل ہیں ۔

(v) شہری علاقوں میں پینے کے پانی کی رسد بڑھانا ، مکانات کی تعمیر کرنا اور ذرائع نقل و حمل کو بہتر بنانا ۔

(vi) پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے ایک حکمت عملی کو اپنانا ۔

(vii) بنیادی صنعت اور انجینئرنگ کی صنعت میں سرمایہ کاری کرنا ۔

(viii) طویل المدت معاشی ترقی کے لیے بنیادیں فراہم کرنا ۔

پانچویں منصوبے کے بڑے بڑے اہداف مندرجہ ذیل تھے :

(i) قومی پیداوار میں 7.2 فی صد سالانہ اضافہ کرنا ۔

(ii) زرعی شعبے میں 6 فی صد سالانہ ترقی کرنا ۔

(iii) صنعتی میدان میں مجموعی طور پر 10 فی صد سالانہ کے حساب سے ترقی کرنا ۔

(iv) اندرون ملک بچتوں کی شرح 12.5 فی صد تک بڑھانا ۔

(v) برآمدات میں 11 فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ کرنا ۔

(vi) پیٹرولیم کی پیداوار میں اس حد تک اضافہ کرنا کہ کل ضرورت کا تینتیس فی صد سے زیادہ اندرون ملک پیداوار سے پورا کیا جا سکے ۔

(vii) فی کس آمدنی میں 9.2 فی صد سالانہ اضافہ کرنا ۔

(viii) توانائی کی فی کس پیداوار میں قریباً 42 فی صد اضافہ کرنا ۔

(ix) دیہی علاقوں کی ترقی پر زور دینا اور صحت کے شعبے میں ہر جہت سے اضافہ کرنا ، نئے ہیلتھ یونٹ و اسپتال قائم کرنا ، اسپتالوں میں مزید بیماروں کے علاج کی گنجائش نکالنا ، ڈاکٹروں و نرسوں کی تعداد میں اضافہ وغیرہ ۔

(x) بنیادی صنعت اور انجینئرنگ کی صنعت میں سرمایہ کاری کرنا ۔

پانچویں پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کا جائزہ 21 ارب دو کروڑ تھا ۔ اس میں سے 14 ارب 82 کروڑ سرکاری شعبہ جات کے لیے اور 6 ارب 20 کروڑ پرائیویٹ شعبے کے لیے مختص کیے گئے تھے ۔

پانچواں پانچ سالہ منصوبہ جون 1983ء کو اختتام پذیر ہوا ۔ اس مدت کے دوران میں بین الاقوامی حالات کافی مخدوش تھے ۔ ترقی پذیر ممالک بالخصوص ان ناسازگار بین الاقوامی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ پاکستان بھی ان حالات سے نہ بچ سکا ۔ اس کے باوجود یہ منصوبہ بعض جہتوں سے کامیاب رہا ۔ حکومت کے ایک جائزہ کے مطابق :

(i) پانچویں پانچ سالہ منصوبہ نے اپنے 90 فی صد ہدف مکمل کر لیے ہیں ۔

(ii) ناسازگار حالات کے باوجود 6 فی صد سالانہ اضافے کی شرح کو برقرار رکھا جا سکا ہے ۔

(iii) ملک کے کم ترقی یافتہ علاقوں میں ترقی کی رفتار بہتر ہوئی ہے ۔

(iv) صوبہ بلوچستان میں ترقیاتی اخراجات کے ضمن میں پانچ گنا اضافہ ہوا ہے ۔

(v) اس منصوبے کی مدت کے دوران میں دیہی علاقوں کی ترقی کی طرف بالخصوص توجہ دی گئی ہے ۔

(vi) کم از کم بیس فی صد نادار ، مفلوک الحال لوگوں کو نظام زکٰوۃ کی بدولت معاشی اعانت ملی ہے ۔ سماجی و معاشی انصاف کی طرف یہ ایک بڑا قدم ہے ۔

(vii) خوراک کے معاملے میں کسی قدر خود کفالت ہو گئی ہے ۔

(viii) افراط زر میں پانچ سال قبل کی شرح 16 فی صد سے کم ہو کر صرف پانچ فی صد رہ گئی ہے ۔

(ix) صنعتی پیداوار میں 9 فی صد سالانہ ترقی ہوئی ہے ۔

(x) ملکی صنعت میں اضافے کی غرض سے صنعتی چھوٹیں بھی دی گئی ہیں ۔

(xi) اس پانچ سالہ منصوبے کے تحت جتنے دیہات کو بجلی فراہم کی گئی ہے ، ان کی تعداد اس سے قبل کے تیس سالوں سے زیادہ ہے ۔

چھٹا پانچ سالہ منصوبہ (1983ء تا 1988ء) یکم جولائی 1983ء کو شروع کیا گیا ۔ اس منصوبے کے بنیادی مقاصد درج ذیل تھے :

(i) معاشی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا ۔
(ii) سماجی انصاف کا احیا کرنا ۔
(iii) دیہی ترقی کو خاص اہمیت دینا ۔
(iv) دیہات میں سڑکوں کا جال بچھا کر انھیں شہری منڈیوں کے ساتھ منسلک کرنا ۔
(v) زیادہ سے زیادہ دیہی علاقوں میں بجلی فراہم کرنا تاکہ دیہی معیشت میں ایک خوش گوار انقلاب ممکن ہو سکے ۔
(vi) منصوبے کے تحت تعلیم و صحت کے شعبوں کو ترجیح دینا ۔
(vii) ملک بھر میں روزگار اور آمدنی میں اضافے کے لیے ایک خاص پروگرام پر عمل کرنا ۔
(viii) زکٰوۃ اور نظام عشر کے توسط سے 15 لاکھ سے زیادہ مستحقین کی مالی اعانت کرنا ۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے (1988ء تا 1993ء) کے بنیادی مقاصد کا خاکہ درج ذیل ہے :-

(i) روزگار کے مواقع فراہم کرنا تاکہ کم از کم تعلیم یافتہ افراد بیروزگاری کا شکار نہ ہوں۔
(ii) بنیادی ضروریات مثلاً خوراک ، رہائش ، صحت ، تعلیم و دیگر سہولیات کو ترجیحی بنیادوں پر فراہم کرنا۔
(iii) افرادی قوت کو تربیت یافتہ بنانا۔
(iv) اپنی مدد آپ کے اصول پر کام کرتے ہوئے قومی معیشت کو مضبوط بنانا۔
(v) نجی شعبے کی اہمیت کے پیش نظر اسے اس کا جائز مقام دے کر ملکی معیشت کے لیے فعال بنانا۔
(vi) غیر ملکی امداد پر کم سے کم انحصار کرنا۔

پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ جات کا جائزہ

(رقوم ملین روپوں میں)

شعبہ	پہلا منصوبہ	دوسرا منصوبہ	تیسرا منصوبہ	چوتھا منصوبہ و نیز منصوبہ جاتی عرصہ	پانچواں منصوبہ	چھٹا منصوبہ	ساتواں منصوبہ
	1955-60	1960-65	1965-70	1970-78	1978-83	1983-88	1988-93
زراعت	461	902	1377	6492	16112	14250	15600
پانی	969	4597	4513	12810	16451	32000	28400
طاقت	607	1293	1760	13841	39395	100000	124300
صنعت	742	478	786	11294	25610	15000	9000
معدنیات	124	94	271	492	480	4950	7000
ذرائع رسل و رسائل	1080	1595	2521	15653	37673	63620	61500
فزیکل پلاننگ و ہاؤسنگ	505	957	698	5687	11900	22800	20000
تعلیم اور افرادی قوت	232	463	563	3442	5944	20500	25700
صحت	76	174	281	2381	4984	14600	13400
بہبود آبادی کا پروگرام	—	9	145	820	660	1800	3500
متفرق	67	44	289	2632	4410	5480	41600
میزان	4863	10606	13204	75544	163619	295000	350000

ماخذ: چھٹا اور ساتواں پانچ سالہ منصوبہ جات مطبوعہ پلاننگ کمیشن حکومت پاکستان۔ اسلام آباد۔

ترقیاتی منصوبوں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد اب ہم پاکستان کی معیشت میں چند شعبوں کی اہمیت کو زیر بحث لائیں گے۔

زراعت :- یہ پاکستانی معیشت کا اہم شعبہ ہے جو بالواسطہ اور بلاواسطہ ہر دو اعتبار سے دیہات میں رہنے والے قریباً 70 فی صد لوگوں کے لیے روزگار فراہم کرتا ہے۔ زرعی شعبہ ملکی آبادی کو خوراک مہیا کرتا ہے، نیز بیشتر ملکی صنعتوں کو خام مال بھی یہی شعبہ فراہم کرتا ہے۔ ہمارے ہاں مجموعی ملکی پیداوار میں زراعت کا حصہ 26.4 فی صد ہے۔

مختلف قومی منصوبوں میں زراعت کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے پانچ سالہ منصوبے (1955ء تا 1960ء) میں اناج کی پیداوار میں اضافے کو بڑی اہمیت دی گئی تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی کو ملکی وسائل سے خاطر خواہ خوراک مہیا کی جا سکے۔ مصنوعی کھاد اور کیڑے مار دوائیوں کے بارے میں وسیع پیمانے پر تحقیق کی گئی۔ اس پروگرام کے نتیجے میں مختلف زرعی اجناس کی پیداوار میں 90 فی صد اضافے کی توقع تھی تاکہ درآمدات پر انحصار میں کمی ہو سکے، لیکن یہ زرعی ہدف حاصل نہ کیے جا سکے۔ نتیجتاً غیر ملکی اناج پر قوم کے دار و مدار میں اضافہ ہوتا گیا۔ دوسرے منصوبے (1960ء تا 1965ء) میں بھی اناج میں خود کفالت حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ زراعت میں ترقی کی شرح 1.3 فی صد سے بڑھ کر دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں 3.5 فی صد ہو گئی، لیکن خوراک کے ضمن میں خود کفالت کا ہدف پھر بھی حاصل نہ ہو سکا اور ملک خوراک کی درآمد پر کثیر زرمبادلہ خرچ کرتا رہا۔ 1969ء ــ 1970ء تک تیسرے پانچ سالہ منصوبے میں گزشتہ منصوبے کی طرح خوراک کی پیداوار میں خود کفالت کے حصول کو ترجیح دی گئی۔ کاشت کاروں کو مصنوعی کھاد، بہتر بیج اور زرعی آلات کے استعمال کے لیے امدادی قرضے دیے گئے۔ پودوں کی حفاظت کے طریقے بھی بروئے کار لائے گئے۔ تجویز پیش کی گئی کہ وسیع پیمانے پر کاشت کاروں کو مدد دی جائے تاکہ زراعت میں سالانہ ترقی کی شرح 5 فی صد ہو جائے۔ ان اقدامات کے کسی حد تک مثبت نتائج برآمد ہوئے اور تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے اختتام پر زرعی ترقی کی شرح 4.5 فی صد ہو گئی۔ چوتھے پانچ سالہ منصوبے (1970ء تا 1975ء) میں بھی خوراک میں خود کفالت کے حصول کو کافی اہمیت دی گئی۔ اس منصوبے میں خام مال کی پیداوار میں اضافے کے لیے ترقی یافتہ طریقوں کے استعمال کی سفارش کی گئی تاکہ اسے ملک میں استعمال کرنے کے علاوہ برآمد بھی کیا جا سکے۔ اس منصوبے میں کاشت کاروں کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے جملہ اقدامات کرنے کی سفارش کی گئی تاکہ انھیں بہتر زندگی گزارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی

جاسکیں۔ پانچویں منصوبے (1978ء تا 1983ء) میں زراعت میں جدید طریقوں کے استعمال کو مزید اہمیت دی گئی تا کہ پیداوار میں اضافہ ہو سکے۔ مصنوعی کھاد اور پانی کے بہتر استعمال کی ترغیب دلانے کا انتظام کیا گیا۔ اس منصوبے کے مطابق پانی کی فراہمی میں 12 فی صد اضافہ، مصنوعی کھاد کی فراہمی میں 100 فی صد اضافہ اور بیج کی تقسیم میں 118 فی صد اضافہ شامل تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ کاشت کاروں کو اور پسماندہ علاقوں کو جدید طریقوں سے روشناس کروانے کی کوشش کی جائے گی۔ چھٹا پانچ سالہ منصوبہ (1983ء تا 1988ء) کے مقاصد میں مصنوعی کھاد و بہتر بیج کے استعمال اور زرعی قرضوں کی فراہمی کو اہمیت دی گئی۔ ساتویں منصوبے کی خاص بات یہ ہے کہ چھوٹے کھیتوں میں بھی کاشت کاری کے جدید طریقے استعمال میں لائے جائیں گے۔ چھوٹے ٹریکٹر اور مشینیں کاشت کاروں کو مہیا کی جائیں گی تا کہ چھوٹے اور درمیانے درجے کے کسانوں کی حالت بہتر بنائی جا سکے۔

زراعت کو ترقی دینے کے لیے اسے برآمد پر مبنی صنعت کا درجہ دیا گیا ہے، جو زراعت کے شعبے کی ترقی میں بالخصوص اور ملکی ترقی میں بالعموم ایک مثبت انقلابی قدم ہے۔

دیہی ترقی: پاکستان کی تقریباً 70 فی صد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دیہات میں فی کس آمدنی شہر کی فی کس آمدنی سے تقریباً 34 فی صد کم ہے۔ شہروں کی نسبت دیہات میں معاشی ترقی کے مواقع کم میسر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیہات کے لوگوں میں شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ ماضی میں جو ترقیاتی منصوبے بنائے گئے تھے، ان میں شہری علاقوں کی ترقی کو زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ شہری اور دیہاتی علاقوں میں معاشی مواقع کے درمیان عدم توازن دور کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی ترقی پذیر معیشت کے لیے دیہاتی ترقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دیہی ترقی کی بدولت دیہاتی آبادی کی اکثریت کو معاشی ترقی کے مواقع حاصل ہوں گے، ان کا معیار زندگی بلند ہوگا اور دیہی معیشت

میں مثبت اور خوش گوار تبدیلی رونما ہوگی۔

1953ء میں دیہی زرعی اور صنعتی ترقی کا پروگرام شروع کیا گیا تاکہ دیہاتی علاقوں کے وسائل اور افرادی قوت کو اہم نوعیت کے تعمیری کاموں میں بروئے کار لایا جا سکے۔ اس پروگرام کا مقصد دیہات کے لوگوں کو اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت کام کرنے کی ترغیب دلانا تھا۔ بعد میں اس پروگرام کی جگہ دیہی ورکس پروگرام نے لے لی۔ دیہی ورکس پروگرام کے مقاصد بھی قریباً وہی تھے جو دیہی زرعی اور صنعتی ترقی کے پروگرام کے تھے۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے دیہاتی ترقی کے پروگرام کا طریق کار اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلیٰ درجے کی مصنوعی کھاد، بیج اور واٹر پانی مہیا کیا جائے۔ دیہات کے لیے طبعی اور معاشرتی ڈھانچہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دیہاتی ترقی کے لیے سرمایہ کاری کی رقم 33 فی صد رکھی گئی ہے۔ جب کہ گذشتہ منصوبہ میں یہ رقم 32 فی صد تھی۔ بیس ہزار دیہات کو بجلی فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ بجلی کی روشنی سے دیہاتی آبادی کی زندگی میں اہم تبدیلیاں رونما ہوں گی۔

اس منصوبے میں دیہات میں سڑکوں کی تعمیر کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سردست صرف 16 فی صد دیہات ایسی سڑکوں پر واقع ہیں جو ہر موسم میں کارآمد رہتی ہیں اور صرف 30 فی صد دیہات کا ہر موسم میں ان سڑکوں سے رابطہ قائم رہتا ہے، لیکن باقی دیہات خراب موسم میں ملک کے دوسرے حصوں سے کٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ منصوبے میں اسی پر زور دیا گیا ہے کہ دیہات کو منڈیوں کی سڑکوں کے نزدیک قائم کیا جائے۔ تعمیراتی کام کی رفتار تیز کرنے کے لیے لوکل کونسلوں کو سڑکوں کی تعمیر کے لیے مشینری فراہم کی جائے۔ جب دیہات کا رابطہ شہروں کے ساتھ قائم ہو جائے گا تو منڈیوں میں زرعی پیداوار زیادہ قیمت پر فروخت کی جا سکے گی۔ سڑکیں دیہاتی علاقوں میں صنعتوں کے قیام میں مددگار ثابت ہوں گی۔ اس طرح دیہی آبادی کو بہتر روزگار کے مواقع میسر آئیں گے۔ منصوبے کا مقصد

کاشت کاروں کی آمدنی میں اضافہ کرنا ہے تاکہ وہ خوش حال زندگی بسر کرسکیں۔ ایسی صورت میں دیہاتی آبادی شہروں کا رخ نہیں کرے گی اور شہری و دیہاتی علاقوں کے مابین معاشی مواقع کے عدم توازن میں کمی واقع ہوگی۔

اس منصوبے کے تحت لوکل کونسلوں پر ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ دیہی علاقوں میں جملہ بنیادی ضروریات فراہم کریں۔ ان میں پانی مہیا کرنا، بہتر طبی سہولتیں فراہم کرنا اور پرائمری، مڈل و ثانوی تعلیم کی حالت بہتر بنانا سرفہرست ہیں۔ اگر دیہاتی آبادی کی یہ ضروریات پوری ہو جائیں اور سماجی خدمت کے متعلقہ ادارے یہ فرائض انجام دیں تو دیہاتی ترقی کی طرف یہ ایک اہم قدم ہوگا۔

پانی اور بجلی: آبپاشی کے لیے پانی کی فراہمی کے دو اہم ذرائع ہیں:

(1) سطحی پانی جو دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں سے سارا سال حاصل کیا جاتا ہے۔

(2) زیر زمین پانی جو ٹیوب ویل، کنوؤں اور کاریزوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔

آبپاشی کے نظام کا انحصار بڑی حد تک دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں سے حاصل ہونے والے پانی پر ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ نہری پانی کا قریباً 60 فی صد حصہ مختلف مقامات پر ضائع ہو جاتا ہے جس سے سطحی پانی کی دستیابی میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ نجی اور سرکاری ہر دو سطحوں پر کوشش کی جائے کہ پانی ضائع نہ ہونے پائے۔ ٹیوب ویلوں کے ذریعے بھی آبپاشی کی جاتی ہے۔ یہ آبپاشی کے لیے پانی کی فراہمی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ٹیوب ویلوں کی ایک قسم اسکارپ (Scarp) ٹیوب ویل ہے۔ ان ٹیوب ویلوں کے ذریعے سیم زدہ زمین کو قابل کاشت بنانے کے لیے پانی کی سطح کو نیچا کر دیا جاتا ہے۔ سیم و تھور کے اثرات سے پاک ہو کر زمین قابل کاشت ہو جاتی ہے۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں آبپاشی کے لیے پانی کے وسائل کو

بہتر بنانے کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے - زرخیز زمینوں کو سیم و تھور کی لعنت سے محفوظ کرنے کے انتظامات کیے گئے ہیں - ان زمینوں پر خاص توجہ دی گئی ہے، جن میں زیر زمین سیم کا پانی موجود ہے - زمینوں کو بتدریج سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کی بھی کوشش کی گئی ہے - زمینی پانی کو محفوظ کرنے کے لیے پرانے ٹیوب ویلوں کی جگہ نئے ٹیوب ویل لگانے کی سفارش کی گئی ہے - آبپاشی اور نکاس کے موجودہ نظام کی اصلاح کی سفارش کی گئی ہے - واٹر مینیجمنٹ پروگرام کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، تاکہ آبی ذرائع سے مکمل فائدہ اٹھایا جاسکے - ایک توسیعی پروگرام کے تحت ان علاقوں میں آبپاشی کی نئی اسکیمیں شروع کرنے کی سفارش کی گئی ہے - جہاں پانی کی قلت ہے، آبی ذخیروں کے لیے نئے تالاب تعمیر کیے جائیں گے تاکہ زیر کاشت رقبہ میں اضافہ ہو سکے - پسماندہ علاقوں میں ٹیوب ویل نصب کیے جائیں گے تاکہ ان علاقوں کو آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں - ایک جامع منصوبے کے تحت مزید دیہات کو بجلی فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ وہ بھی ترقی کے میدان میں بھرپور حصہ لے سکیں - مختصراً یہ کہ آبی وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں تفصیلی پروگرام وضع کیا گیا ہے -

توانائی: گیس، تیل، کوئلہ اور پن بجلی پاکستان میں قوت کے روائیتی ذرائع ہیں - قریباً 65 فی صد قوت کی ضروریات ان ذرائع سے پوری کی جاتی ہیں - لکڑی اور جانوروں کے گوبر کے استعمال سے باقی ماندہ 35 فی صد ضروریات پوری کی جاتی ہیں - یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ تیل اور گیس ملک میں قوت کی تقریباً تین چوتھائی سے زیادہ ضروریات پوری کرتے ہیں - گیس نے کسی حد تک کوئلہ کی جگہ لے لی ہے، اور گھریلو ضروریات کے لیے توانائی مہیا کرنے کا بڑا ذریعہ بن گئی ہے - ہمارے ملک میں کوئلے کے ذخائر ہیں تو وافر مقدار میں مگر یہ کوئلہ زیادہ اچھی قسم کا نہیں ہے - ملک میں تیل کی پیداوار کی بھی قلت ہے، اس لیے بڑی مقدار میں تیل درآمد کیا جاتا ہے جس پر زرمبادلہ

کی کثیر رقم خرچ آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کچھ عرصہ سے تیل کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے کیونکہ بعض جگہوں سے بالخصوص آدھی، لغاری اور خاصخیلی کے مقامات پر تیل دریافت ہوا ہے توقع ہے کہ اس سے ملک میں خرچ ہونے والے تیل کی 10 فی صد ضروریات پوری ہو سکیں گی۔ گزشتہ چند برس سے توانائی کے حصول کے لیے ملک کا انحصار زیادہ تر گیس پر ہو گیا ہے ادھر گیس کے ذخیرے میں تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں پن بجلی کے استعمال میں اضافہ ہوا ہے، بہرحال گیس کے مزید ذخائر دریافت ہونے کی توقع ہے۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں توانائی کو ترقی دینے پر زور دیا گیا ہے تاکہ توانائی کے بحران پر قابو پایا جا سکے۔ اس میں گوبر گیس، شمسی توانائی، ہوائی توانائی اور چھوٹے پن بجلی گھروں کو ترقی دینے کی سفارش کی گئی ہے جو ہری توانائی کی ترقی پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے از حد ضروری ہے تاکہ ملک توانائی کی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکے، لیکن اس ضمن میں بین الاقوامی مخالفت کا بھی سامنا ہے۔ قومی مفاد کی خاطر اس دباؤ کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبہ میں شعبۂ توانائی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ کیونکہ جب تک وافر مقدار میں برقی قوت پیدا نہیں کی جائے گی، خاطر خواہ ترقی ممکن نہ ہوگی۔

تعلیم: انسانی وسائل کو ترقی دینے اور معاشی و معاشرتی ترقی کے لیے شعبہ تعلیم میں مناسب سرمایہ کاری نہایت اہم ہے۔ تعلیم اور معاشی و معاشرتی ترقی کے مابین گہرا تعلق ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی قومی آمدنی میں اضافہ تعلیم کے فروغ سے ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں منصوبہ بندی کرنے والے کچھ عرصے تک تعلیم کی اہمیت سے زیادہ آگاہ نہ ہو سکے، اس لیے تعلیم کے شعبہ کے لیے ضرورت سے کم رقوم مختص کی جاتی رہی ہیں۔ یہ رجحان اب بدل گیا ہے۔ اب ترقی پذیر ممالک شعوری طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ مجموعی قومی آمدنی میں سے جس قدر ممکن ہو زیادہ رقوم تعلیم کے شعبہ کو دیں۔ پاکستان بھی تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف ہے،

یہی وجہ ہے کہ ساتویں منصوبے میں اس شعبے کو اس کا اصل مقام دیتے ہوئے بہت اہمیت دی گئی ہے۔

پانچویں منصوبے میں تعلیم کے لیے 5.6 بلین روپے اور چھٹے منصوبے میں 19.9 بلین روپے رکھے گئے تھے۔ جب کہ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں 23.1 بلین روپے رکھے گئے ہیں۔

مجموعی ترقیاتی اخراجات میں تعلیم کے حصے میں 6 فیصد سے اضافہ ہو کر 7 فی صد ہو گیا ہے۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ منصوبے میں اعلیٰ تعلیم کے مقابلے میں پرائمری اور ثانوی تعلیم کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

مندرجہ ذیل گوشوارے سے اس امر کا اندازہ ہو جائے گا۔

شعبہ	چھٹے منصوبے کی مختص رقم (ملین روپوں میں)	ساتویں منصوبے کی مختص رقم (ملین روپوں میں)
پرائمری تعلیمی پروگرام	7000	10128
ثانوی تعلیمی پروگرام	4125	6404
ٹیکنیکل تعلیمی پروگرام	1315	2000
کالج کا تعلیمی پروگرام	1300	615
یونیورسٹی تعلیمی پروگرام	2100	1800

منصوبے کے مطابق لازمی تعلیم کے لیے خصوصی کوشش کی جائے گی۔ توقع ہے کہ منصوبے کے آخری سال تک تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو جو پہلی جماعت میں داخلے کی عمر کو پہنچ جائیں گے، اسکولوں میں داخل کیا جائے گا۔ یہ ایک قابل ستائش مقصد ہے لیکن یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ تعلیم ترک کرنے کی موجودہ

شرح میں کمی کی جائے۔ اس کے علاوہ ترک تعلیم کے رجحان کو کم کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

پرائمری درجہ میں یہ شرح 30 سے 40 فی صد تک ہے، تعلیم ترک کرنے سے مراد یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں اسکول کی آخری جاعت تک پہنچنے سے پہلے ہی ترک تعلیم کر رہے ہیں۔ فرض کریں کہ 100 طالب علم اول جاعت میں داخل ہوتے ہیں، لیکن چالیس طالب علم تعلیم مکمل کیے بغیر اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اس تعلیمی ضیاع کی عکاسی کرتا ہے۔ ترک تعلیم کے اس تناسب میں کمی کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ دیہاتی لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہوتی ہیں جن پر قابو پانے کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں پرائمری درجے کی تعلیم کی ترقی کے لیے تفصیلی پروگرام وضع کیا گیا ہے۔

اس پروگرام پر عمل درآمد کے لیے 10.12 بلین روپے کی رقم مختص کی گئی ہے. پرائمری اسکولوں کے لیے عمارتوں کی تعمیر اشد ضروری ہے کیونکہ اسکولوں کی ایک خاصی تعداد باضابطہ عمارتوں کے بغیر چل رہی ہے۔

1972ء کی مردم شماری کے مطابق خواندگی کی شرح 21.7 فی صد تھی جو بڑھ کر 1981ء میں 26.2 ہو گئی. ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے مطابق 1993ء تک خواندگی کی شرح 40 فی صد ہو جانے کی توقع ہے۔ شرطیکہ مالیاتی اور سماجی و معاشی رکاوٹوں پر قابو پا لیا جائے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ خواندگی زندگی کو بہتر بناتی ہے نیز کارکنوں کی حصول علم و تربیت کی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں ثانوی درجہ کی تعلیم کو معیاری اور باعمل بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس منصوبے میں سابقہ معیار تعلیم کو غیر تسلی بخش قرار دیتے ہوئے زور دیا گیا ہے کہ مجموعی طور پر اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کو دور کیا جائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم اور عملی کام پر زیادہ توجہ دی جائے۔ اس سلسلے میں اہم نکات یہ ہیں:

(i) لیبارٹریوں ، لائبریریوں ، سائنسی سامان اور ان سے متعلقہ اسٹاف کو بہتر بنایا جائے۔

(ii) نصاب میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے۔ اساتذہ کی کمی کو دور کرنے کے لیے ایف۔ ایس۔ سی اور بی۔ ایس۔ سی کے طالب علموں سے مدد لی جائے۔

اس طرح ایک اندازے کے مطابق ثانوی سطح پر مزید 40 فی صد طلبہ علم حاصل کر سکیں گے۔

اعلیٰ تعلیم ڈگری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جائے گی۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں مندرجہ ذیل باتوں پر زور دیا گیا ہے:

(i) اس سطح کے تعلیمی اداروں کو مزید وسعت دینے کے بجائے ان کے معیار کو بہتر بنایا جائے۔

(ii) سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین پر خاص طور پر زور دیا جائے۔ یونیورسٹیوں میں نصاب ، درسی کتب ، لیبارٹریوں کی حالت اور اساتذہ کے معیار کو بہتر کیا جائے تا کہ ان میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے پروگرام بہتر طور پر چلائے جا سکیں۔

پانچویں پانچ سالہ منصوبے میں عام تعلیمی نظام میں اسلامی تعلیمات کو مربوط کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اب اسلامیات کو پہلی جماعت سے چودھویں جماعت تک لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات، کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے عربی کو چھٹی سے آٹھویں تک لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں اس کام کو مربوط بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جملہ نصاب برائے اسلامیات کو قرآنی تعلیمات کے مطابق کرنے اور اساتذہ کو اس سلسلے میں ٹریننگ دینے پر زور دیا گیا تھا۔ اسی منصوبے کے تحت کراچی ، لاہور اور پشاور میں اسلامی مراکز کھولنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اس کا مقصد مسلمان علما کو موقع فراہم کرنا ہے تا کہ

وہ اسلامی تعلیمات کو جدید علوم کے مطابق سمجھ سکیں۔
ساتویں منصوبے میں ان تمام شعبہ جات کو مزید مؤثر بنانے پر زور دیا گیا ہے۔

صحت : پاکستان میں عام شہری کی صحت اور درازیٔ عمر ترقی یافتہ ممالک کے شہریوں کی نسبت کم تر ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بیشتر صورتوں میں نامکمل و ناکافی غذا ملتی ہے نیز مناسب طبی سہولتیں بھی میسر نہیں۔ شرح اموات 11 افراد فی ہزار ہے۔ بچوں کی شرح اموات 80 فی ہزار ہے، اور زچگی میں شرح اموات 6.8 فی ہزار ہے۔ پاکستان میں صحت کی خراب حالت کے بنیادی اسباب معاشی غربت، ناقص غذا، صفائی کا فقدان اور طبی سہولتوں کی غیر مساویانہ تقسیم ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد میں اضافہ تو ہوا ہے لیکن ان کا استفادہ اس لیے محدود ہے کہ اکثر اسپتال شہروں میں بنائے گئے ہیں۔ بیشتر دیہاتی آبادی کے لیے ڈسپنسریاں تو ہیں مگر ڈاکٹر موجود نہیں ہیں کیونکہ اکثر ڈاکٹر دیہات کے اسپتالوں اور ڈسپنسریوں میں کام کرنے سے گریزاں ہیں۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں نہ صرف موجودہ سہولیات کو بہتر کیا جائے گا بلکہ امراض کی روک تھام سے متعلق اقدامات کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ صحت کے جدید نظام کو دیہات میں رائج کیا جائے گا۔ پانچ ہزار سے دس ہزار کی آبادی کے علاج کے لیے صحت کا یونٹ قائم کیا جائے گا۔ ہر یونٹ میں ایک سند یافتہ ڈاکٹر کا تقرر کیا جائے گا۔ اس یونٹ میں آیا کا تقرر بھی کیا جائے گا۔ اسکول کے بچوں کے علاج اور معائنے کا بالخصوص انتظام کیا جائے گا۔ اس قسم کے پانچ یا چھ یونٹوں کو دیہی مرکز صحت کے ماتحت کر دیا جائے گا۔ مرکز صحت میں 15 بستروں کا انتظام کیا جائے گا اور ایک لیبارٹری قائم کی جائے گی۔ ایکسرے کرنے اور غیر پیچیدہ سرجری کا بندوبست کیا جائے گا۔ مرکز صحت کا تعلق ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز اسپتال سے قائم کیا جائے گا جہاں ہر قسم کی سہولت فراہم کی جائے گی۔ ڈسپنسریوں کو

بھی علاج کرنے کے لیے ضروری سہولیات بہم پہنچائی جائیں گی ۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں 13.35 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں جب کہ چھٹے منصوبے میں اس مد کے تحت صرف 4.58 ارب روپے رکھے گئے تھے

صنعت : کسی بھی ترقی پذیر ملک کے لیے صنعت بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔ صنعتی ترقی معیشت کے دیگر شعبوں میں ترقی کا پیش خیمہ ہوتی ہے ۔ عوام کی حقیقی آمدنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی صنعتی اشیا کا مطالبہ بھی بڑھ جاتا ہے ۔ دیہاتی علاقے کی فارغ یا نیم فارغ افرادی قوت ، صنعت میں کھپ جاتی ہے ۔ صنعتی اشیا تیار کرکے زرمبادلہ بھی حاصل کیا جاتا ہے ۔

پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی کرنے والے صنعت کی اہمیت سے غافل نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی ملکی پیداوار میں صنعت کا حصہ 6 . 2 صد رکھا گیا ہے ۔ صنعتی اشیا کی برآمدات پاکستان کی کل برآمدات کا 5 . 6 صد ہیں ۔ 1955ء میں منصوبہ بندی کے بعد پاکستان میں صنعتی ترقی میں کافی اضافہ ہوا ہے ۔ کوالٹی کی طرف ترغیب دلانے کی البتہ اب بھی ضرورت ہے ۔ حکومت پاکستان نے گھریلو صنعت کو تحفظ دینے کی کوشش کی ہے لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں ہوا کیونکہ بیشتر صورتوں میں صارفین کو غیر معیاری اشیا گراں قیمت پر دستیاب ہوتی ہیں ۔

1959ء تا 1960ء کے عرصے میں صنعت بڑی حد تک نجی شعبے کے ہاتھ میں تھی ۔ اس شعبے کو صنعتی فروغ کے لیے کافی مراعات دی گئیں لیکن نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں ملک کے مختلف طبقات کی آمدنی میں کافی فرق پیدا ہو گیا ہے ۔ سرکاری شعبہ نے ایسی صنعتیں قائم کیں جن پر کافی لاگت آتی تھی ، اور پیچیدہ تکنیکی مہارت کی ضرورت تھی ۔ چنانچہ سرکاری شعبہ نے پسماندہ علاقوں میں صنعتیں قائم کیں ۔ پاکستان کی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے ایسی صنعتیں قائم کرنے میں پیش قدمی کی جن کے قیام کے لیے نجی شعبہ تیار نہ تھا ۔ وہ صنعتیں جو پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے تیار کیں ، بعد میں انھیں

نجی شعبہ کو منتقل کر دیا گیا۔ سر کاری شعبہ نے منافع کو پیش نظر نہ رکھا تھا بلکہ معاشی پیداوار کو اپنا مطمع نظر بنایا۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں سر کاری اور نجی شعبہ میں امتزاج کا نیا تصور پیش کیا گیا ہے ۔ سر کاری شعبہ ایک نگران کے فرائض سرانجام دے گا نیز ایسا ڈھانچہ ترتیب دینے میں مدد دے گا جو نجی شعبے میں ممد ثابت ہو۔ سر کاری شعبہ زیادہ تر ایسی صنعتیں قائم کرے گا جن پر بڑی رقوم خرچ ہوں گی اور جن کو قائم کرنے کے لیے نجی شعبہ تیار نہیں ہوگا۔ ایسی صنعتوں کے قیام کے لیے نئی ٹیکنالوجی کی ضرورت ہوتی ہے ، نیز پیداواری اشیا کی قیمتیں غیر یقینی ہوتی ہیں ۔ انھی وجوہات کی بنا پر نجی شعبہ ایسی صنعتیں قائم کرنے سے گھبراتا ہے ۔ حکومت کی موجودہ پالیسی یہ ہے کہ نجی شعبہ کو صنعت میں اہم مقام دیا جائے ۔ اسے صنعت کو قومیائے جانے کا خوف نہ ہو اور وہ ملک کی صنعتی ترقی میں بھرپور حصہ لے سکے ۔ نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے ساتویں منصوبے میں صنعتوں کو مراعات دی گئی ہیں ، تاکہ ان میں مقابلہ کی صلاحیت پیدا ہو۔ صنعتی ترقی کے لیے 9 بلین روپے مختص کئے گئے ہیں۔ نجی شعبہ کی بنا کا انحصار اہلیت اور مقابلہ پر رکھا گیا ہے ، نہ کہ محض سر کاری تحفظ پر ۔ فولاد پر منحصر انجینئرنگ کا سامان بنانے والی صنعتوں کو بہت اہمیت دی گئی ہے ۔ کراچی میں فولاد کے کارخانے کے قیام نے انجینئرنگ کا سامان بنانے والی صنعتوں کے قیام کا احساس دلایا ہے ، کیونکہ انجینئرنگ کے سامان کا مطالبہ مختلف شعبوں مثلاً ریلوے ، ٹرانسپورٹ ، رسل و رسائل کے محکمے کرتے ہیں۔ ملکی صنعتوں میں استعمال کے لیے بجلی کے سامان اور مشینری کی ضرورت ہوگی ، اس لیے اس طرف بھی توجہ دی جائے گی ۔ ملک میں اس وقت مندرجہ ذیل اہم صنعتیں قائم ہیں:

شکر سازی :۔ ملک میں شکر تیار کرنے کے تقریباً 50 کارخانے موجود ہیں ، ان کی سالانہ پیداواری صلاحیت ڈیڑھ ملین ٹن سے کچھ زیادہ ہے۔

حکومت نے نجی شعبہ کو بھی شکر کے کارخانے لگانے کی اجازت دے دی ہے - گذشتہ کئی سالوں سے حکومت نے شکر درآمد نہیں کی ہے کیونکہ ملک اس میں خود کفیل ہو چکا ہے -

بناسپتی گھی : اس وقت 42 کارخانے بناسپتی گھی تیار کرنے میں مصروف ہیں - ان کی پیداواری صلاحیت ملکی ضرورت کے حساب سے کافی ہے - اس شعبے میں صورت حال تسلی بخش ہے اور ملک میں اس کی کمی کی کوئی شکایت نہیں ہے - گھی بنانے میں خوردنی تیل استعمال ہوتا ہے - بین الاقوامی منڈیوں میں تیل کی قیمت میں بہت اضافہ ہوا ہے - پاکستان میں سورج مکھی کی کاشت میں حال ہی میں دلچسپی لی گئی ہے - کچھ علاقوں میں خوردنی تیل حاصل کرنے کے لیے سورج مکھی کی کاشت شروع ہو گئی ہے تا کہ پاکستان خوردنی تیل کے بارے میں غیر ممالک پر انحصار نہ کرے -

سیمنٹ : سرکاری شعبہ میں سیمنٹ کے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت قریباً پانچ ملین ٹن ہے - ملکی ضروریات کے پیش نظر کچھ سیمنٹ درآمد بھی کرنا پڑتا ہے - سیمنٹ کے مختلف کارخانے اسٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن آف پاکستان کی زیر نگرانی کام کر رہے ہیں -

کیمیائی کھاد : نائٹروجن کھاد تیار کرنے والے کارخانوں کی سالانہ پیداواری صلاحیت قریباً سوا ملین ٹن ہے ، جو ملکی ضروریات کے لیے کافی ہے - فاسفیٹ کھاد تیار کرنے والے کارخانوں کی سالانہ پیداوار ملکی ضروریات کے لیے ناکافی ہے ، یہی وجہ ہے کہ حکومت نے نجی شعبہ میں کھاد کے کارخانے لگانے کی اجازت دے دی ہے تا کہ کھاد کی کمی کو دور کیا جا سکے -

تجارتی شعبہ : پاکستان کی معیشت میں برآمدات اہم کردار ادا کرتی ہیں -

اس طرح نہ صرف زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے بلکہ ایسی اشیا بھی ملتی ہیں جو معیشت کے فروغ کے لیے ضروری ہیں۔ اشیا کی طلب میں اضافہ ہوتا ہے جس سے صنعتی سرگرمیوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت ایسی پالیسی پر عمل کر رہی ہے جس سے پیداوار میں اضافہ ہو اور برآمدات میں وسعت ملے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کی کوشش کی جا رہی ہے:

(الف) زرعی اور صنعتی شعبوں کی پیداوار میں اضافہ تا کہ فاضل پیداوار برآمد کی جا سکے۔

(ب) برآمدی اشیا پیدا کرنے والی صنعتوں کی حوصلہ افزائی۔

(ج) مختلف اشیا کی مختلف ممالک کو برآمد۔

زرمبادلہ میں اضافے کے لیے حکومت کئی اقدامات کر رہی ہے۔ مختلف برآمدی اشیا پر مراعات دی گئی ہیں۔ ایکسائز ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس میں رعائت اور مشینری کی درآمد پر ڈیوٹی معاف کر دی گئی ہے تا کہ توازن قائم رہے اور پرانی مشینوں کی جگہ بہتر اور جدید مشینیں لگائی جا سکیں۔ برآمدی مالیاتی اسکیم وضع کی گئی ہے۔ درآمدات کے مقابلے میں ممکنہ حد تک آزادانہ پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ لاہور اور کراچی میں برآمدات کے زون قائم کیے گئے ہیں۔ جنوری 1982ء میں پاکستان نے اپنے روپے کا تعلق ڈالر سے ختم کر لیا۔ یہ بھی دراصل اسی مقصد کے حصول کی ایک کڑی تھا۔

درآمدی پالیسی: برآمدات کو فروغ دینے کے ساتھ بدلتے ہوئے بین الاقوامی حالات اور ملکی معاشی حالات کے مطابق درآمدی پالیسی وضع کی جاتی ہے۔ 1989ء ـــ 1990ء کی درآمدی پالیسی کے اہم نکات مندرجہ ذیل تھے:

(1) صنعتی شعبے کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کیا گیا اور نئی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لیے خام مال اور صنعتی سامان کی فراہمی کی ضمانت دے دی۔

(2) درآمدی اشیا کی متبادل اشیا بنانے اور برآمدات کو فروغ دینے کی سعی کی گئی ۔

(3) نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کی گئی تا کہ وہ قومی معیشت میں سرگرم ہو جائے ۔

(4) صنعتی کارکردگی میں اضافہ اور صنعتوں میں خود اعتمادی کی بحالی کے لیے انھیں بین الاقوامی مقابلے کے لیے آمادہ کیا گیا ۔

(5) اشیائے صرف کی فراہمی میں اضافہ تا کہ قیمتوں میں اضافے کو روکا جا سکے ۔

(6) ملکی صنعتوں پر درآمدات کے ضرر رساں اثرات کا سد باب کیا گیا۔

برآمدات :- کچھ برآمدی اشیا ایسی ہیں جن پر پاکستان کی درآمدات کا بڑی حد تک انحصار ہے - ان اشیا میں چاول، سوتی دھاگہ، سوتی کپڑا، چمڑا اور قالین شامل ہیں- گذشتہ چند سالوں کے عرصے میں متفرق اشیا کی برآمد میں بھی اضافہ ہوا ہے - 90-1989ء کے مالی سال میں برآمدات کا ہدف 5000.71 مقرر کیا گیا تھا-

ماہرین کی رائے میں موجودہ تجارتی پالیسی سے تجارتی خسارہ کم کرنے میں مدد ملے گی نیز تجارتی تعلقات وسیع ہوں گے -

سوالات

(الف) مختصر جواب دیں :

1۔ پاکستان میں معاشی منصوبہ بندی کی اہمیت پر نوٹ لکھیں ۔

2۔ پانچویں پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کا تنقیدی جائزہ لیں ۔

3۔ چھٹے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کے اہم بنیادی مقاصد لکھیں ۔

4۔ درج ذیل شعبوں کی معیشتِ پاکستان میں جو اہمیت ہے، اس پر نوٹ لکھیں۔

(i) زراعت۔

(ii) دیہی ترقی۔

(iii) تعلیم۔

(ب) درست کے سامنے ✓ کا نشان لگائیں:

1۔ پاکستان ایک ــــ ملک ہے۔ (ترقی پذیر، ترقی یافتہ، پسماندہ)

2۔ پاکستان میں افزائش آبادی کی شرح وسائل کی نسبت ــــ ہے۔ (کم، بلند، برابر)

3۔ پہلے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کا آغاز ــــ میں ہوا۔ (1947ء، 1955ء، 1957ء)

4۔ دس سالہ تناظری ترقیاتی منصوبے کی میعاد ــــ تھی۔ (1947ء تا 1967ء، 1950ء تا 1970ء، 1965ء تا 1985ء)

5۔ چھٹا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ ــــ سے شروع کیا گیا۔ (1977ء، 1980ء، 1983ء)

6۔ پاکستان کی تقریباً ــــ فی صد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ (80، 70، 63)

7۔ دیہات میں فی کس آمدنی شہر کی فی کس آمدنی سے ــــ ہے۔ (کم، زیادہ، برابر)

8۔ دیہی زرعی اور صنعتی ترقی کا پروگرام ــــ میں شروع کیا گیا۔ (1947ء، 1953ء، 1977ء)

9۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں تعلیم کے لیے ــــ بلین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ (23.1، 11.4، 19.9)

10۔ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں خواندگی کی شرح ــــ فی صد ہے۔ (21.7، 26.2، 45)



پاکستان اور عالمی برادری

فی زمانہ کوئی ملک باقی دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہ کر اپنی تمام ضروریات پوری نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنے مسائل کو کلی طور پر حل کر سکتا ہے۔ اس بڑھتے ہوئے باہمی انحصار کی وجہ سے ہر ملک کو دیگر ممالک سے دو طرفہ، علاقائی اور بین الاقوامی بنیادوں پر تعلقات استوار کرنے پڑتے ہیں۔

پاکستان دیگر ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس نے بڑی طاقتوں کی باہمی آویزشوں سے دامن بچاتے ہوئے دنیا کے قریباً ہر ملک سے سفارتی روابط قائم کیے ہوئے ہیں۔ ان تعلقات کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی گئی ہے، ان میں اہم درج ذیل ہیں:

(i) اپنی آزادی اور خود مختاری کا تحفظ۔

(ii) دوسروں کی آزادی، خود مختاری اور اقتدار اعلیٰ کا احترام۔

(iii) دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل سے احتراز۔

(iv) اقوام متحدہ کے چارٹر پر سختی سے عمل۔

(v) دنیا میں انسانی حقوق، امن اور آشتی کو فروغ دینا۔

(vi) نسلی امتیاز کی مخالفت اور حق خود ارادیت کی حمایت۔

پاکستان تیسری دنیا کے حقوق اور مفادات کی حفاظت کے لیے پیش پیش رہتا ہے اور بین الاقوامی اقتصادی نظام میں ایسی دور رس تبدیلیوں کے حق میں ہے جس سے دنیا میں اقتصادی اور سیاسی انصاف کو فروغ ملے۔ پاکستان

کئی بین الاقوامی اداروں کا سرگرم ممبر بھی ہے مثلاً

اقوام متحدہ	United Nations (UN)
غیر وابستہ ممالک کی تحریک	Non-Aligned Movement (NAM)
اسلامی کانفرنس کی تنظیم	Organization of Islamic Council (OIC)
علاقائی تعاون برائے ترقی	Regional Co-operation for Development (RCD)

اس کا نیا نام Economic Co-operation Organization (ECO) ہے -

پاکستان کی خارجہ پالیسی کی ایک نمایاں خصوصیت اسلامی ممالک سے قریبی تعلقات استوار کرنا ہے - پاکستان کے تمام آئینوں میں اسلامی ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے - ہماری حکومت کی کوشش رہی ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں اسلامی ممالک سے برادرانہ تعلقات رکھے جائیں - پاکستان نے ہمیشہ اسلامی ممالک کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھا ہے اور ان کے حل کے لیے حتی المقدور تعاون کیا ہے - اسلامی دنیا کے مسائل کو حل کرنے کی کوششوں میں بین الاقوامی سطح پر پاکستان بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے - پاکستان نے اسرائیل کے مقابلے میں عربوں کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے - فلسطینیوں کے حقوق اور ان کے قومی تشخص کی ہمیشہ حمایت کی ہے - اس کے علاوہ اسلامی کانفرنس کے قیام اور اس کو مؤثر بنانے میں بھی پاکستان نے اہم کردار ادا کیا ہے -

اقوام متحدہ

دوسری جنگ عظیم (1939ء تا 1945ء) کی ہولناکیوں کے پس منظر میں دنیا کے چند بڑے سیاسی قائدین نے کافی غور و خوض و باہمی مشورہ کے بعد اور چند دیگر ممالک کی رضا مندی سے 24-اکتوبر 1945ء کو اقوام متحدہ کی داغ بیل ڈالی تا کہ آنے والی نسلوں کو جنگ کے شعلوں سے محفوظ رکھا جا سکے -

اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق ادارے کے اہم مقاصد درج ذیل ہیں :

1۔ بین الاقوامی امن اور سلامتی قائم کرنا۔

2۔ مشترکہ طور پر ایسے اقدامات کرنا جن سے عالمی امن کو خطرات کم ہوں، جارحانہ اقدامات کو روکا جا سکے اور بین الاقوامی تنازعات کو انصاف اور بین الاقوامی قوانین کے مطابق طے کیا جا سکے۔

3۔ ایک دوسرے کی آزادی و خود مختاری اور اقتدار اعلیٰ کا احترام کرتے ہوئے برابری کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات استوار کرنا، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے پرہیز کرنا۔

4۔ اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی اور دوسرے انسانی مسائل کو حل کرنے کے لیے بین الاقوامی تعاون کو بڑھانا اور رنگ، زبان، مذہب اور جنس کی تمیز کیے بغیر انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا احترام کرنا۔

5۔ درج بالا مقاصد کے حصول کے لیے کیے گئے اقدامات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مرکزی کردار ادا کرنا۔

اقوام متحدہ سب سے بڑا بین الاقوامی ادارہ ہے۔ جون 1993ء تک اس کے ممبر ممالک کی تعداد 183 تھی جو کہ دنیا کے ہر خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے چھے بنیادی ادارے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ جنرل اسمبلی، سلامتی کونسل، اقتصادی اور معاشرتی کونسل، تولیتی کونسل، سیکرٹریٹ اور عالمی عدالت انصاف۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کے دو درجن سے زیادہ مخصوص ادارے ہیں جو بنی نوع انسان کی قابل قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور ادارے یہ ہیں۔

ادارہ خوراک و زراعت — Food and Agriculture Organization (FAO)

عالمی ادارہ صحت — World Health Organization (WHO)

بچوں کا عالمی فنڈ — United Nations International Children Emergency Fund (UNICEF)

بین الاقوامی تعلیمی سائنسی و ثقافتی ادارہ United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization (UNESCO)

پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کا ہائی کمشنر United Nations High Commissioner for Refugees (UNHR)

بین الاقوامی ادارہ محنت International Labour Organization (ILO)

عالمی بینک WORLD-BANK

قیام پاکستان کے صرف ڈیڑھ ماہ بعد 30 ستمبر 1947ء کو پاکستان اقوام متحدہ کا ممبر بنا۔ اس روز سے پاکستان اقوام متحدہ کی کارروائیوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لے رہا ہے اور اس ادارے کو فعال بنانے میں کوشاں ہے۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مؤثر کردار کا چار پہلوؤں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

اول: پاکستان اقوامِ متحدہ کے مقاصد سے مکمل اتفاق کرتا ہے، یہاں تک کہ یہ اصول اور مقاصد، پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اہم ستونوں میں سے ہیں۔ پاکستان کی کوشش رہی ہے کہ بین الاقوامی اور علاقائی تنازعات کو اقوام متحدہ کے اصولوں کی روشنی میں حل کیا جائے تاکہ عالمی سطح پر امن و آشتی کو فروغ ملے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اپنے ذرائع کو اسلحہ کی خرید اور جنگ و جدل کی بجائے عوامی فلاح و بہبود پر صرف کر سکیں گے۔

دوم: پاکستان نے اقوام متحدہ کی مختلف قراردادوں اور فیصلوں کا ہمیشہ احترام کیا ہے اور دیگر ممبران کو ایسا کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری حکومت نے اقوام متحدہ کی ان تمام کوششوں کی حمایت کی ہے جو اس کے چارٹر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کی جاتی رہی ہیں۔ دنیا میں نسلی امتیاز ختم کرنے، محکوم قوموں کی آزادی اور اقتصادی و معاشرتی ترقی کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی کوششوں میں پاکستان بھرپور حصہ لے رہا ہے۔

سوم: پاکستان نے اقوام متحدہ کے بنیادی اور مخصوص اداروں کی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جنرل اسمبلی کے عمومی اور خصوصی

اجلاسوں میں پاکستان کے مندوبین نے عالمی مسائل پر اپنے نقطۂ نظر کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے ۔ پاکستان کے ایک مندوب کو جنرل اسمبلی کی صدارت کا اعزاز بھی ملا ۔ پاکستان ، سلامتی کونسل کا کئی بار غیر مستقل رکن منتخب ہوا ۔ اسی طرح اقتصادی اور معاشرتی کونسل نیز تولیتی کونسل کی کارروائیوں میں پاکستان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹریٹ میں پاکستانیوں کی ایک معقول تعداد کام کر رہی ہے ۔ پاکستان کے ایک سابق وزیر خارجہ نے نو سال تک عالمی عدالت انصاف کے جج کے فرائض سرانجام دیے ہیں ۔

چہارم : جب ہالینڈ نے مغربی ایریان کو انڈونیشیا کے حوالے کرنے پر رضا مندی کا اظہار کیا تو پاکستانی فوج کے دستے نے اقوام متحدہ کی امن فوج کی حیثیت سے عبوری مدت کے لیے مغربی ایریان میں امن و امان قائم رکھنے کے فرائض سرانجام دیے ۔ اس طرح اقوام متحدہ کی ان کوششوں کو تقویت ملی جو وہ عالمی امن کو فروغ دینے کے لیے کر رہی ہے ۔

اقوام متحدہ کے مختلف مخصوص ادارے پاکستان میں ترقی اور معاشرتی بہبود کے بہت سے منصوبوں میں اقتصادی اور فنی امداد دے رہے ہیں ۔ ان اداروں میں عالمی خوراک پروگرام ، پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کا ہائی کمشنر ، اقوام متحدہ کا بچوں کا فنڈ ، عالمی ادارہ صحت اور اقوام متحدہ کا ترقیاتی پروگرام United Nations Development Programme (UNDP) قابل ذکر ہیں ۔ ان کے تعاون سے کافی منصوبے مکمل کیے گئے ہیں اور کئی دوسرے منصوبوں پر کام جاری ہے ۔

کشمیر کے تنازعے کے سلسلے میں پاکستان کو اقوام متحدہ سے کافی مایوسی ہوئی ہے ۔ یہ مسئلہ 1948ء سے اقوام متحدہ کے سامنے ہے ۔ سلامتی کونسل نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے قراردادیں منظور کیں کہ کشمیری عوام ، استصواب رائے سے ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کریں گے ۔ ان میں سے کسی قرارداد پر عمل نہ ہو سکا ۔ اقوام متحدہ نے کئی

کمیشن برصغیر بھیجے، لیکن اُس مسئلے کے حل کی طرف کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بھارت نے سلامتی کونسل کی قراردادوں کو یکسر نظر انداز کرکے ریاست جموں و کشمیر میں استصواب رائے کروانے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے یہ مسئلہ آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اقوام متحدہ جیسا عالمی ادارہ، بھارت کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکا کہ وہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت کے استعمال کا موقع دے کر اس وعدے کو پورا کرتا جو بھارت نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں کیا تھا۔

غیر وابستہ ممالک کی تحریک

یہ ایک اہم بین الاقوامی انجمن ہے۔ اس کی جڑیں اس کانفرنس سے جا ملتی ہیں جو اپریل 1955ء میں انڈونیشیا کے شہر بنڈونگ میں منعقد ہوئی۔ پاکستان نے اس کانفرنس میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ اس کانفرنس کا بڑا مقصد ان ممالک کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا جو دونوں بڑی طاقتوں میں سے کسی کے حاشیہ بردار نہیں بننا چاہتے تھے۔ اس کانفرنس میں شریک ممالک نے باہمی تعلقات کے پانچ اصول منظور کیے، جنھیں پنج شیلا کے نام سے موسوم کیا گیا۔ وہ اصول ہیں۔ (i) ایک دوسرے کے اقتدار اعلیٰ اور علاقائی خود مختاری کا احترام (ii) جارحیت سے پرہیز (iii) ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینا۔ (iv) برابری اور باہمی افادیت (v) پُر امن بقائے باہمی۔

1961ء میں یوگوسلاویہ کے شہر بلغراد میں 25 غیر وابستہ ممالک کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی، جس نے بنڈونگ کانفرنس کی قراردادوں اور پنج شیلا کے اصولوں کی بنیاد پر غیر وابستہ ممالک کی تحریک کو باقاعدہ تنظیم کے طور پر قائم کیا۔ بلغراد کانفرنس میں منظور ہونے والی قراردادوں کے ذریعے غیر وابستہ ممالک کی تحریک نے محکوم قوموں کی آزادی، غیر ملکی فوجی اڈوں کے

خاتمے اور تخفیفِ اسلحہ کی حمایت کی۔ اس کے علاوہ چند امیر ممالک اور تیسری دنیا کے غریب ممالک کے مابین اقتصادی تفاوت اور معیار زندگی میں فرق کو کم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

غیر وابستہ ممالک کے سربراہان مملکت کی پہلی کانفرنس (بلغراد کانفرنس) کے بعد دیگر کانفرنسیں ان مقامات پر منعقد ہوئیں: دوسری کانفرنس 1964ء میں قاہرہ (مصر)؛ تیسری کانفرنس 1970ء میں لوساکا (زمبیا)؛ چوتھی کانفرنس 1974ء میں الجیرز (الجیریا)؛ پانچویں کانفرنس 1976ء میں کولمبو (سری لنکا)؛ چھٹی کانفرنس 1979ء میں ہوانا (کیوبا)؛ ساتویں کانفرنس 1983ء میں نئی دہلی (بھارت)۔ آٹھویں کانفرنس 1986ء میں ہرارے (زمباوے)، نویں کانفرنس 1989ء میں بلغراد (یوگوسلاویہ)۔

پاکستان نے اگرچہ بنڈونگ کانفرنس میں اہم کردار ادا کیا لیکن غیر وابستہ تحریک کے باقاعدہ قیام کے وقت پاکستان اس میں شامل نہ ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بھارت اور افغانستان کی طرف سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان نے امریکہ سے ایک دفاعی معاہدہ۔ سیٹو South East Asia Treaty Organization (SEATO) اور معاہدہ بغداد (بعد میں اس کا نام سینٹو رکھا گیا Central Treaty Organization (CENTO) میں شمولیت اختیار کرکے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک سے فوجی امداد اور تعاون کا طریقہ اپنایا۔

1960ء کے عشرے میں بدلتے ہوئے بین الاقوامی حالات کی وجہ سے پاکستان کی حکومت نے محسوس کیا کہ مغربی ممالک پر اپنے انحصار کو کم کرکے اپنے تعلقات کا دائرہ وسیع کرنا چاہیے۔ اس بات کا زیادہ احساس 1965ء کی پاکستان اور بھارت جنگ کے دوران ہوا جب امریکہ اور مغربی الحاقی ممالک نے نہ صرف پاکستان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اسلحہ کی ترسیل پر پابندی لگا دی۔ پاکستان نے مغربی ممالک سے وابستگی کی خارجہ پالیسی پر بتدریج نظرثانی کرکے آزاد خارجہ پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اس رجحان کو 1971ء کی پاکستان اور بھارت کی جنگ

کے بعد مزید فروغ ملا کیونکہ 1965ء کی جنگ کی طرح 1971ء کی پاکستان اور بھارت کی جنگ کے دوران میں بھی مغربی ممالک نے عملی امداد کرنے سے انکار کر دیا ۔ پاکستان نے پہلے سیٹو (SEATO) اور پھر سینٹو (CENTO) کو خیر باد کہا ۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ہمیشہ اصول رہا ہے کہ بڑی طاقتوں کی باہمی آویزش سے دور رہ کر تمام ممالک سے دو طرفہ بنیادوں پر دوستانہ تعلقات استوار کیے جائیں۔ اس طرح غیر وابستہ ممالک کی تحریک کا باقاعدہ ممبر نہ ہونے کے باوجود پاکستان ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہے کہ اس تحریک کے بنیادی اصولوں پر عمل کرے ۔

1976ء میں غیر وابستہ ممالک کے سربراہوں کی پانچویں کانفرنس میں پاکستان نے مبصر کی حیثیت سے شرکت کی ۔ تین سال بعد 1979ء میں ہوانا میں منعقد ہونے والی چھٹی کانفرنس کے موقع پر پاکستان اس تحریک کا باقاعدہ ممبر بن گیا ۔ اب پاکستان غیر وابستہ ممالک کی تحریک کی سفارتی سرگرمیوں میں سرگرمی سے حصہ لیتا ہے اور اس کے ممبر ممالک کے سیاسی ، اقتصادی اور دیگر مسائل کی نہایت مؤثر طور پر وکالت کرتا ہے ۔

نویں سربراہی کانفرنس (1989ء) میں پاکستان نے افغانستان میں اندرونی شورش سے پیدا شدہ صورت حال کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلاً روشنی ڈالی ۔ اس کانفرنس میں موجود بیشتر مندوبین نے ان معاملات پر پاکستان کے مؤقف کی حمایت کی ۔ کانفرنس کے آخری اعلامیہ میں مسئلہ افغانستان کے لیے سیاسی حل کی ضرورت پر زور دیا گیا تاکہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان سے باہر موجود افغان مہاجرین کی واپسی ممکن ہو سکے ۔

اسلامی کانفرنس کی تنظیم

مسلمانانِ عالم کی دیرینہ خواہش تھی کہ ایک ایسا پلیٹ فارم قائم کیا جائے جس پر تمام اسلامی ممالک اکٹھے ہو کر اپنے مشترکہ مسائل کا حل تلاش

کریں ، باہمی اخوت کو بڑھائیں اور عالم اسلام کو در پیش بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے لائحہ عمل تیار کریں - اس مقصد کے حصول کی طرف واضح قدم اس وقت اٹھایا گیا جب اگست 1969ء میں مقبوضہ بیت المقدس میں واقع مسجد اقصیٰ میں آتشزدگی کا واقعہ ہوا - عرب وزرائے خارجہ کی کانفرنس نے اس سانحہ پر غور کرنے کے بعد تجویز پیش کی کہ اس واقعہ سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے کے لیے اسلامی ممالک کے سربراہان ریاست و حکومت کی کانفرنس منعقد کی جائے - اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے ابتدائی اقدامات کرنے کی ذمہ داری سعودی عرب اور مراکش کے وزرائے خارجہ کے سپرد کی گئی - انہوں نے باہمی مشورہ سے ایک سات رکنی کمیٹی بنائی تا کہ اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کی جا سکے - پاکستان اس کمیٹی کا رکن تھا - اس کمیٹی نے اسلامی ممالک کی حکومتوں سے مشورے کے بعد ستمبر 1969ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا - اس طرح اسلامی کانفرنس کی داغ بیل پڑی -

اسلامی کانفرنس کا سب سے اعلیٰ ادارہ سربراہوں کی کانفرنس ہے - اسلامی کانفرنس منعقدہ 1981ء کے فیصلے کے مطابق اب سربراہوں کی کانفرنس ہر تین سال بعد ہوتی ہے - دوسرا اہم ادارہ وزرائے خارجہ کی کانفرنس ہے جس کا سال میں کم از کم ایک اجلاس ہوتا ہے - وسط 1989ء تک وزرائے خارجہ کے سترہ باقاعدہ اجلاس منعقد ہوئے - اس کے علاوہ وزرائے خارجہ کے خصوصی اور غیر معمولی اجلاس بھی ہوتے رہتے ہیں - پاکستان میں اب تک وزرائے خارجہ کے تین اجلاس ہو چکے ہیں -

اسلامی کانفرنس کا صدر دفتر سعودی عرب کے شہر جدہ میں قائم کیا گیا ہے جس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ایک سیکرٹری جنرل کے سپرد ہے - اسلامی کانفرنس نے کئی ذیلی تنظیمیں قائم کی ہیں - ان میں سے چند کے نام یہ ہے :

1- اسلامی ترقیاتی بنک -

2- بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی -

3. اسلامی ریاستوں کی براڈ کاسٹنگ کی تنظیم
4. اسلامی ممالک کے دارالخلافوں کی تنظیم۔
5. اسلامی اتحاد فنڈ۔
6. القدس فنڈ۔

اسلامی عدالت انصاف قائم کرنے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے۔

اسلامی کانفرنس کی تفصیلات: اسلامی کانفرنس کی تنظیم کی پہلی سربراہی کانفرنس ستمبر 1969ء میں مراکش کے صدر مقام رباط میں منعقد ہوئی جس میں 24 مسلم ممالک نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں مسجد اقصیٰ میں آتشزدگی کے واقعہ اور عرب اسرائیل تنازعہ پر غور کیا گیا، نیز اسلامی ممالک میں قریبی تعلقات کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

مسلم ممالک کی دوسری سربراہی کانفرنس فروری 1974ء میں لاہور میں منعقد ہوئی جس میں چالیس وفود نے شرکت کی۔ لاہور میں اس کانفرنس کا انعقاد پاکستان کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اتنی تعداد میں مسلم ممالک کے سربراہان ریاست و حکومت یہاں تشریف لائے۔ اس کانفرنس میں عالم اسلام کو درپیش جن مسائل پر بالخصوص غور کیا گیا، ان میں سے چند اہم یہ تھے:

(i) مشرق وسطیٰ کا مسئلہ خصوصاً فلسطینیوں کے حقوق کا مسئلہ۔
(ii) یروشلم اور عربوں کے دیگر مقبوضہ علاقوں سے اسرائیل کا اخراج۔
(iii) مسلم دنیا میں غربت و افلاس اور جہالت کے خاتمہ کے لیے اقدامات۔
(iv) ترقی یافتہ ممالک کے ہاتھوں ترقی پذیر ممالک کے استحصال کا خاتمہ۔
(v) آپس میں دوستی اور تعاون کی ضرورت۔

تیسری سربراہی کانفرنس سعودی عرب کے شہر طائف میں جنوری 1981ء میں منعقد ہوئی۔ 38 ممبران اور کئی مبصرین نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ کانفرنس کے اختتام پر ایک اعلامیہ جاری کیا گیا جسے اعلان مکہ کا نام دیا

گیا ۔ اس اعلان میں دنیائے اسلام کو در پیش مسائل کا تفصیلی جائزہ لے کر انہیں انصاف ، اسلامی بھائی چارہ اور دیگر ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے پرہیز کی بنیاد پر پُرامن طریقے سے حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ۔ ایران اور عراق کی آپس میں 1980ء سے ہونے والی جنگ کے خاتمے ، مسئلہ افغانستان کے سیاسی حل ، مسئلہ فلسطین کو طے کرنے اور مقبوضہ عرب علاقوں کو اسرائیل کے قبضہ سے واگزار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ۔ اس کانفرنس میں متفقہ طور پر طے کیا گیا کہ دفاعی میدان میں اسلامی ممالک میں تعاون بڑھانے کے لیے سیکریٹریٹ میں فوجی شعبہ قائم کیا جائے ۔

چوتھی سربراہی کانفرنس جنوری 1984ء میں مراکش کے شہر کاسا بلانکا میں منعقد ہوئی جس میں 42 ممبران اور کچھ مبصرین نے شرکت کی ۔ اس کانفرنس کے موقع پر ان حالات و واقعات کا خصوصیت سے اور تفصیلاً جائزہ لیا گیا جو تیسری سربراہی کانفرنس 1981ء اور چوتھی سربراہی کانفرنس 1984ء کے درمیانی عرصے میں مسلم دنیا میں رونما ہوئے ۔ کانفرنس کے اختتام پر جاری شدہ اعلان کاسا بلانکا اور منظور شدہ قراردادوں میں ان تمام سیاسی ، اقتصادی اور دفاعی مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے جو مسلم ممالک کو در پیش ہیں ۔

مشرق وسطیٰ کے مسئلے کے سلسلے میں چوتھی سربراہی کانفرنس نے کہا کہ اس مسئلے کا کوئی ایسا حل قابلِ قبول نہیں ہو گا جس میں تنظیم آزادی فلسطین کو فلسطینیوں کا نمائندہ تسلیم نہ کیا گیا اور فلسطینیوں کی علیحدہ ریاست کے قیام کی ضمانت موجودہ نہ ہو ۔ افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلا کا مطالبہ کیا گیا ۔ اس کے علاوہ ایران اور عراق سے درخواست کی گئی کہ وہ جنگ کو ختم کرکے اپنے تنازعات پُر امن طریقے سے طے کریں ۔ قبرص کے مسئلے کے حل کے لیے ترک قبرصیوں کے حقوق کی مؤثر ضمانت دینے اور گفت و شنید سے معاملات طے کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ۔ نمیبیا (NAMIBIA) کے سلسلے میں مسلم سربراہان کی کانفرنس نے مطالبہ کیا کہ اقوام متحدہ ، جنوبی افریقہ کی حکومت کے خلاف لازمی پابندیاں عائد کرے ۔

اس کانفرنس کے موقع پر مصر کو اسلامی کانفرنس کی تنظیم میں دوبارہ شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یاد رہے کہ مصر کو اسلامی کانفرنس سے مئی 1979ء میں اس وقت خارج کر دیا گیا تھا جب اس نے تمام عرب ممالک سے علیحدہ ہو کر اسرائیل سے امن معاہدہ کر لیا تھا۔

پانچویں اسلامی سربراہی کانفرنس جنوری 1987ء میں کویت میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرس میں ان تمام معاملات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا، جو آج کل مسلم دنیا کو درپیش ہیں اجلاس کے اختتام پر جو اعلامیہ جاری کیا گیا، اسے اعلامیہ کویت کہتے ہیں۔ اس کی رو سے کانفرنس نے مسلم ممالک پر زور دیا کہ وہ باہمی اتحاد کو فروغ دیں اور اپنے اندرونی مسائل اسلامی بھائی چارے کے اصولوں کے مطابق حل کریں۔اسی طرح باہمی اقتصادی تعاون اور بین الاقوامی سطح پرتعاون کرنے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔

چھٹی اسلامی سربراہی کانفرنس دسمبر 1991ء میں سینیگال کے دارالحکومت ڈاکار میں منعقد ہوئی۔ جس میں 45 مسلم ممالک نے شرکت کی۔ کانفرنس کے دوران باہمی تعلقات کو مزید فروغ دینے کے لیے کئی فیصلے کیے گئے۔ کانفرنس میں کئی قراردادیں بھی پاس کی گئیں جن میں مسئلہ فلسطین، مسئلہ افغانستان اور مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے کہا گیا۔ اس کے علاوہ امریکہ کی طرف سے لیبیا کو دی گئی دھمکی پر بھی تشویش کا اظہار کیا گیا۔

اسلامی ممالک کے سربراہوں اور وزرائے خارجہ کی کانفرنسوں نے اسلامی دنیا پر اچھے اثرات مرتب کیے ہیں۔ تمام اسلامی ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے مسائل پر غور و فکر کرنے اور اتحاد عالم اسلامی کو فروغ دینے کے مواقع ملے ہیں۔ ان کانفرنسوں کی قراردادوں کے مطابق اسلامی ممالک نہایت انہماک سے اسرائیلی جارحیت کے اثرات کو ختم کرنے، مقبوضہ عرب علاقوں کی بازیابی اور فلسطینیوں کی قومی حیثیت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کروانے کے لیے کوشاں ہیں۔ مختلف بین الاقوامی اداروں میں اب مسلمانوں کی آواز زیادہ مؤثر ہو گئی ہے۔ اقتصادی میدان میں اسلامی کانفرنسوں کے فیصلوں کی روشنی میں تیل کی دولت سے مالا مال مسلمان ممالک، غریب ممالک کو بہت مفید امداد مہیا کر رہے ہیں تاکہ ان ممالک میں ترقی کی رفتار کو تیز کیا جا سکے۔

پاکستان ہمیشہ مسلم ملت کے تصور کا علمبردار رہا ہے۔ قیام پاکستان

کے فوراً بعد سے پاکستان نے مسلم ممالک سے قریبی تعلقات استوار کیے تاکہ تمام اسلامی ممالک کو ایک دوسرے کے قریب لاکر مسلمانوں کی منتشر قوتوں کو یکجا کیا جاسکے۔ لہذا جب پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا گیا تو پاکستان نے اس کی تیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دوسری سربراہی کانفرنس میں پاکستان نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیئے۔ تیسری چوتھی، پانچویں اور چھٹی سربراہی کانفرنسوں میں پاکستان سفارتی سطح پر بہت سرگرم رہا۔ پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر 1980ء میں پاکستان کے صدر نے اسلامی کانفرنس کے نمائندہ کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا۔ پاکستان کے لیے یہ ایک اعزاز ہے۔

افغانستان میں خانہ جنگی اور روس کی فوجی مداخلت پر اسلامی کانفرنس نے پاکستان کے مؤقف کی بھرپور حمایت کی۔ اسلامی کانفرنس کے کافی ممالک نے انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت پاکستان میں موجود افغان مہاجرین کی امداد کے لیے مالی امداد، خوراک، ادویات، خیمےاور دوسرا ضروری سامان مہیا کیا ہے۔

علاقائی تعاون برائے ترقی

ابتداً جولائی 1964ء میں ایران، پاکستان، اور ترکی نے باہمی رضامندی سے علاقائی تعاون برائے ترقی کی بنیاد رکھی۔ اب اس تنظیم کا نیا نام اقتصادی تعاون کی تنظیم (Economic Co-operation Organization) ہے۔ ان تینوں ہمسایہ ممالک میں صدیوں پرانے مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی روابط ہیں۔ اس تنظیم کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اقتصادی، صنعتی، تجارتی اور تعلیمی میدانوں میں ان تینوں ممالک کے موجودہ تعلقات میں وسعت پیدا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کرنا:

1۔ ایران ، پاکستان اور ترکی کے مابین تجارت اور اشیا کی آزادانہ نقل و حمل کو فروغ دینا۔

2۔ مشترکہ مقاصد کے منصوبوں کی تیاری اور ان پر عملدرآمد کرنا۔

3۔ ممبر ممالک کے مابین ڈاک اور تار کی اسی شرح کا نفاذ کرنا جو ان کے اندرون ملک نافذ ہے۔

4۔ تینوں ممالک کے ایوان ہائے تجارت میں قریبی روابط قائم کرنا تا کہ ایک مشترکہ ایوان تجارت کا قیام ممکن ہو سکے۔

5۔ تینوں ممالک کے مابین ذرائع رسل و رسائل کو بہتر بنانا۔

اس سلسلے میں سڑکیں بنانا ، ڈاک اور تار کی سہولتیں بڑھانا ، ریلوے کے نظام کو بہتر کرنا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہوائی سفر کی سہولتیں اور بالآخر تینوں ممالک کے اشتراک سے ایک اچھی اور مضبوط ہوائی کمپنی بنانا بھی اس تعاون کا حصہ ہے۔

6۔ جہاز رانی کے میدان میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا اور ایک مشترکہ جہاز راں کمپنی کا قیام عمل میں لانا۔

7۔ تینوں ممالک میں سیر و سیاحت کو فروغ دینا اور ویزا سسٹم کو ختم کرنا۔

8۔ صنعتی اور تکنیکی میدان میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا۔

9۔ ثقافتی اور علمی میدانوں میں قریبی تعلقات استوار کرنا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک دوسرے کے طلبہ کو وظائف اور دوسری ضروری سہولتیں مہیا کرنا۔ دوستی اور تعاون کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسرے کے ممالک میں ثقافتی مراکز قائم کرنا اور ثقافتی وفود کے تبادلوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

علاقائی تعاون برائے ترقی کے انتظامی ڈھانچے کی سب سے اعلیٰ تنظیم وزرائے خارجہ یا دیگر نامزد وزرا پر مشتمل وزارتی کونسل ہے جو تمام اہم امور کے فیصلے کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک علاقائی منصوبہ بندی کونسل بھی

قائم کی گئی ہے جو ممبر ممالک کے منصوبہ بندی کے عمل میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ضروری اقدامات کی سفارش کرتی ہے۔ علاقائی منصوبہ بندی کونسل تینوں ممالک کے منصوبہ بندی کے شعبوں کے اعلیٰ ترین افسران پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے تحت چند ذیلی کمیٹیاں بھی کام کرتی ہیں۔ اس تنظیم کا سیکریٹریٹ تہران میں ہے جو ایک سیکریٹری جنرل، چند ڈپٹی سیکریٹری جنرل اور ماتحت عملہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ وقتاً فوقتاً تینوں ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کا انعقاد بھی ہوتا ہے۔

علاقائی تعاون برائے ترقی نے مشترکہ مقاصد کے کئی منصوبوں پر عملدرآمد کیا۔ جن میدانوں میں تیزی سے تعاون بڑھا، ان میں تجارت، ذرائع نقل و حمل، سیر و سیاحت، بینکنگ، بیمہ، جہاز رانی اور ڈاک و تار قابلِ ذکر ہیں۔ تینوں ممالک کے مابین خشکی کے راستے سفر کی سہولتوں کو بہتر کرنے کے لیے علاقائی تعاون برائے ترقی کی شاہراہ تعمیر ہو رہی ہے۔ یہ شاہراہ کراچی کو تہران اور انقرہ سے ملا دے گی۔

صنعتی میدان میں تعاون کو فروغ دینے کے لیے پہلے منصوبے کے طور پر بیس صنعتوں کو چنا گیا ہے۔ ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں۔ الیکٹرانکس، ادویات، آئرن اور اسٹیل، کان کنی، کار سازی، جہاز سازی، کھاد اور زراعت میں استعمال ہونے والے آلات۔ ایک مشترکہ جہاز راں کمپنی قائم ہو چکی ہے۔ مشترکہ بنیادوں پر بیمہ کمپنیوں کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے۔ ڈاک اور تار کی شرح کم کی گئی ہے۔ تینوں ممالک کے نشر و اشاعت کے ادارے اور خبر رساں ایجنسیاں ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں۔ طلبہ کو وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔

1979ء میں ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد ایرانی حکومت کی تمام تر توجہ اپنے اندرونی مسائل کی طرف اتنی مبذول ہوئی کہ وہ علاقائی تعاون برائے ترقی کے ادارہ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکی۔ یہ سلسلہ چند سال جاری رہا۔ 1984ء میں ایران نے اس تنظیم کو دوبارہ فعال بنانے کے لیے

پاکستان اور ترکی کی طرف رجوع کیا- ان دونوں ممالک نے ایران کے خیال سے اتفاق کیا- اس ادارہ کو دوبارہ فعال بنانے کے لیے آر - سی - ڈی کے سیکریٹری جنرل نے ممبر ممالک کے دورے کر کے متعلقہ حکام سے رابطہ قائم کیا- اس گفت و شنید کے بعد 1985ء میں تنظیم کا نیا نام اقتصادی تعاون کی تنظیم (E.C.O) رکھ دیا گیا-

16، فروری 1992ء کو اس تنظیم کا دو روزہ پہلا سربراہی اجلاس ایران کے دارالحکومت تہران میں منعقد ہوا- اس اجلاس میں وسط ایشیا کی چار نوآزاد مسلم ریاستوں آذربائیجان، ازبکستان، ترکمانستان اور تاجکستان کو باقاعدہ تنظیم کا ممبر بنا دیا گیا-

اجلاس منعقدہ اسلام آباد بتاریخ 28 نومبر 1992ء کو افغانستان اور وسطی ایشا کی بقیہ دو مسلم ریاستوں قازقستان اور کرغستان کو بھی اس تنظیم کا ممبر بنالیا گیا اسطرح اب یہ دس رکنی تنظیم ہے۔

پاکستان یہ سمجھتا ہے کہ اقتصادی، صنعتی، تجارتی اور ثقافتی میدانوں میں مندرجہ بالا برادر ممالک ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں- مزید برآں ان میدانوں میں تعاون بڑھانے سے نہ صرف اقتصادی ترقی کی رفتار تیز ہو گی اور ان ممالک کے عوام کو فائدہ پہنچے گا بلکہ اس خطے میں وحدت ملت اسلامیہ کے تصور کو بھی فروغ ملے گا-

سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں :

1۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول کون کون سے ہیں ؟

2۔ اقوام متحدہ کے قیام کی ضرورت کیوں پیش آئی - اس کے بنیادی مقاصد کون کون سے ہیں ؟ نیز اس کے پانچ اداروں کے نام لکھیں -

3۔ غیر وابستہ ممالک کی تحریک پر جامع نوٹ لکھیں -

4 اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا ایک مقصد یہ تھا کہ اسلامی ممالک اکٹھے ہو کر مشترکہ مسائل کو حل کریں ، باہمی اخوت بڑھائیں

اور عالم اسلام کو درپیش بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے لائحہ عمل تیار کریں۔ آپ بتائیں کہ یہ تنظیم اپنے عزائم میں کس حد تک کامیاب ہوئی۔

5 - اقتصادی تعاون کی تنظیم کے ممبر ممالک کے مابین تعاون کو کس حد تک فروغ دیا گیا ہے۔

(ب) درست کے آگے ✓ کا نشان لگا دیں :

(i) پاکستان کی خارجہ پالیسی کی ایک نمایاں خصوصیت اسلامی ممالک سے تعلقات استوار کرنا ہے۔

(ii) UNESCO یونیسکو بچوں کے عالمی فنڈ کا مخفف ہے۔

(iii) آئی ۔ ایل ۔ او بین الاقوامی ادارہ محنت کا مخفف ہے۔

(iv) پنچ شیلہ کے نام سے منسوب اصول اسلامی کانفرنس کے قیام کا باعث بنے۔

(v) اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا مقصد بڑی طاقتوں کے درمیان طاقت کے توازن کو برقرار رکھنا ہے۔

(ج) جملے مکمل کیجئے:

(i) اقوام متحدہ کی داغ بیل ---------- میں ڈالی گئی۔
(1919ء، 1939ء، 1945ء)

(ii) مارچ 1992ء تک اقوام متحدہ کے ممبروں کی تعداد ------- تھی۔
(15، 178، 185)

(iii) پاکستان اقوام متحدہ کا ممبر ------- میں بنا۔
(1947ء، 1948ء، 1949ء)

(iv) غیر وابستہ ممالک کی تحریک کا قیام --------- میں ہوا۔
(1955ء، 1961ء، 1964ء)

(v) پاکستان غیر وابستہ تحریک کا ممبر ---------- میں بنا۔
(1947ء، 1955ء، 1979ء)

(vi) اسلامی کانفرنس کی تنظیم کی پہلی سربراہی کانفرنس ---------- میں ہوئی۔

(1947ء ، 1969ء ، 1947ء)

(vii) ایران میں اسلامی انقلاب ---------- میں رونما ہوا۔

(1964ء ، 1979ء ، 1981ء)

(د) مختصر جواب دیں:

1 - پاکستان کن کن بین الاقوامی اداروں کا سرگرم رکن ہے؟

2 - اقوام متحدہ کے اہم اداروں کے نام لکھیں۔

3 - اسلامی کانفرنس کی تین ذیلی تنظیموں کے نام لکھیں۔

4 - NAM کس کا مخفف ہے؟

5 - علاقائی تعاون برائے ترقی کا نیا نام کیا ہے؟

6 - اقتصادی تعاون کی تنظیم نے صنعتی میدان میں تعاون کو فروغ دینے کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں؟

تیار کردہ: سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ - و منظور کردہ:
بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کراچی۔ حیدرآباد
اور سکھر:

قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد کِشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان اَرضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد
پاک سرزمین کا نظام قُوّتِ اُخوّتِ عوام
قوم، مُلک، سلطنت پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد
پرچمِ ستارہ و ہلال رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال جانِ اِستقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

2459
سلسلہ وار نمبر

پبلشرز کوڈ نمبر ایس - ٹی - بی - ۸

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	تعداد اشاعت	قیمت
دسمبر 1993ء	پہلا ایڈیشن	۱۰،۰۰۰	12.45 روپے